وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِنْ كُنتُمْ مُؤْمِنِينَ

چند یادیں — چند باتیں

عبدالماجد دریابادی کی ڈاکٹر اسرار احمد سے گفتگو

# ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

## ڈاکٹر اسرار احمد


مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن — لاہور

PEPSI

MIRINDA

پنجاب بیوریجز کمپنی لمیٹڈ۔ فیصل آباد۔ فون: ۲۶۰۳۹ / ۲۲۹۳۱

ماہنامہ
# میثاق
لاہور

جلد ۳۴ | اگست ۱۹۸۵ء مطابق ذیقعدہ ۱۴۰۵ھ | شمارہ ۸

## مشمولات

○ عرضِ احوال ____ ۴

○ چند یادیں ۔ چند باتیں ____ ۵
مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کی
ڈاکٹر اسرار احمد سے گفتگو

○ اسلامی انقلاب ____ ۲۳
مراحل، مدارج اور لوازم (قسط ۳)
ڈاکٹر اسرار احمد

○ ڈاکٹر اسرار احمد انٹرویو کے آئینے میں ۵۷
امیرِ تنظیم سے نمائندہ "چٹان" کا انٹرویو

○ افکار و آراء ____ ۸۷

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمن
حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ تنظیم اسلامی ۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

کراچی دفتر کا فون نمبر
۲۱۶۵۸۶

رفقائے تنظیم اسلامی توجہ فرمائیں!

تنظیم کی مرکزی مجلس مشاورت کے اجلاس منعقدہ ۲ مئی ۸۵ء میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ

تنظیم کی دعوت کی توسیع رفقاء کی تربیت اور رابطہ باہمی کے فروغ کیلئے

# کُل پاکستان سالانہ اجتماع

کے علاوہ سال ۸۵-۸۶ء کے دوران کم از کم چار

# علاقائی اجتماعات

منعقد کئے جائیں اور ہر رفیق تنظیم اپنے علاقائی اجتماع کے علاوہ کم از کم ایک اور اجتماع میں شرکت کرے!

اس سلسلے کا پہلا اجتماع ان شاء اللہ العزیز

## ۵ تا ۸ اگست ۸۵ء راولپنڈی میں منعقد ہوگا

جس میں شمالی پنجاب، صوبہ سرحد، آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات کے رفقاء شریک ہوں گے۔

اور دوسرا اجتماع ان شاء اللہ

## ۱۳ تا ۱۸ ستمبر ۸۵ کوئٹہ میں منعقد ہوگا

بقیہ دو اجتماعات ان شاء اللہ العزیز نومبر میں ملتان اور حیدرآباد میں منعقد ہوں گے

تنظیم اسلامی شمالی پنجاب، صوبہ سرحد، آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات کا

# دعوتی و تربیتی اجتماع

اِن شاء اللہ العزیز

۵ تا ۸ ر اگست ۱۹۸۵ء

## فیض الاسلام کمپلکس، فیض آباد، مری روڈ، راولپنڈی

میں منعقد ہوگا جس میں

روزانہ بعد نمازِ مغرب **امیر تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد** کا خطاب عام ہوگا

اور صبح ۸ بجے سے دن کے ایک بجے تک تربیتی پروگرام جاری رہیگا!

(نوٹ: سوموار ۵ ر اگست کی شام کا خطاب عام حسب معمول کمیونٹی سنٹر، آب پارہ اسلام آباد میں ہوگا۔ اور باقی تمام پروگرام فیض آباد ہی میں منعقد ہونگے۔)

جملہ رفقاءِ تنظیم سے درخواست ہے کہ اولاً ۵ اگست کی دوپہر تک ورنہ رات تک لازماً فیض آباد پہنچ جائیں

المعلن: (چوہدری) غلام محمد، قیم تنظیم اسلامی پاکستان

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

# عرضِ احوال

ذیقعدہ ۱۴۰۵ھ مطابق اگست ۸۵ء کا شمارہ چند اہم مضامین پر مشتمل قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ ان مضامین کی طوالت کے باعث اس ماہ نہ "الھدیٰ" کی قسط شاملِ اشاعت ہوسکی اور نہ "حذرجم" کی جس کے لئے ادارہ معذرت خواہ ہے۔

اس شمارے کا جواہر پارہ وہ گفتگو ہے جو محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ نے ۲۳ر اپریل کو برِصغیر پاک وہند کے جید عالمِ دین، محقق ومفکر، متعدد علمی وتاریخی کتب کے مصنف، ندوۃ المصنفین دہلی کے یکے از بانیان، ماہنامہ 'برہان' دہلی (بھارت) کے مدیرِ اعلیٰ سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ اور صدر شعبۂ دینیات علی گڑھ یونیورسٹی (بھارت) مولانا سعید احمد اکبر آبادی رحمۃ اللہ علیہ ونوّر مرقدہٗ سے ان کی اس دارِ فانی سے دار البقاء کی طرف مراجعت سے قریباً ایک ماہ قبل کی تھی۔ یہ اغلباً مولانا مرحوم کی آخری مفصل گفتگو ہے جو ریکارڈ ہو گئی ہے۔

دوسرا اہم مضمون "اسلامی انقلاب کے مراحل، مدارج اور لوازم" کے موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحب مدظلہ کے مسلسل خطابات کی تیسری قسط ہے۔ جو صرف انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی تفہیم ہی کے لئے مفید نہیں ہوگی۔ بلکہ ان شاء اللہ جب کبھی بھی اللہ تعالیٰ نے کسی مسلم ملک میں "اسلامی انقلاب" کے لئے حالات سازگار فرمائے تو اس سلسلۂ خطابات سے کافی رہنمائی مل سکے گی۔

"افکار وآراء" کے زیرِ عنوان بھی بعض فکر انگیز خیالات قارئین کی نظر سے گزریں گے ــــــ توقع ہے کہ بحیثیتِ مجموعی یہ شمارہ قارئین کافی مفید پائیں گے۔

تنظیمِ اسلامی کی مجلسِ مشاورت کے فیصلے کے مطابق ۵ر سے ۸ر اگست تک تنظیمِ اسلامی کا ایک زونل تربیتی وتنظیمی اجتماع فیض آباد کمپلکس، مری روڈ میں منعقد ہو رہا ہے جس کا تفصیلی اعلان اسی شمارے میں قارئین کی نظر سے گزر چکا ہوگا۔ توقع ہے کہ متعلقہ علاقوں کی تنظیموں کے جملہ رفقاء اور وہ حضرات جو تنظیم کی دعوت سے دلچسپی رکھتے ہیں اس اجتماع میں شرکت کی ہر امکانی کوشش کریں گے۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم!

# چند یادیں ۔ چند باتیں

## مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ کی

# ڈاکٹر اسرار احمد سے گفتگو

---

۲۲ اپریل ۸۵ء کو محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کراچی میں جناب مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم ومغفور کی عیادت کو تشریف لے گئے تھے۔ بھائی عبدالواحد عاصم صاحب اور راقم الحروف بھی ہمراہ تھے۔ مولانا مرحوم نے بڑی خوش دلی کے ساتھ ہم سب کا خیر مقدم کیا۔ وہ کافی نحیف لاغر اور کمزور نظر آ رہے تھے لیکن چہرے پر طمانیت اور لہجہ صاف تھا۔ البتہ اندازِ گفتگو سے کسی قدر نقاہت کا اظہار ہوتا تھا۔ مولانا نے محاضراتِ قرآنی کی روداد سننے کی خواہش ظاہر فرمائی۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے اختصار کے ساتھ محاضرات کی کارروائی سنائی جس پر مولانا مرحوم نے نہایت مسرت کا اظہار فرمایا اور ڈاکٹر صاحب کو مبارکباد دی کہ آپ نے واقعی نہایت جرأت مندانہ اور قابلِ تحسین قدم اٹھایا تھا کہ خود اپنے پلیٹ فارم پر اپنے "تصورِ فرائضِ دینی" پر ملک کے نامور علماءِ کرام کو تنقید اور اختلاف کرنے یا توثیق وتصویب کی دعوت دی۔ مولانا نے فرمایا کہ اس دور میں جبکہ تحزّب کا یہ عالم ہے کہ کوئی بھی جماعت اپنے پلیٹ فارم پر اپنے مؤیدین اور متفقین کے علاوہ کسی بھی دوسرے شخص کو چاہے وہ کتنا ہی بڑا اور مشہور عالمِ دین ہی کیوں نہ ہو تقریر کی اجازت نہیں دیتی جبکہ اس کا کسی اختلافی بات کہنے کا ارادہ بھی نہ ہو اور وہ صرف دینِ مبین کی مثبت دعوت ہی پر اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہو ـــــ اس ضمن میں مولانا مرحوم نے چند واقعات بھی سنائے۔

دوسرے دن ۲۳ اپریل کو ہم مرحوم کی خدمت میں ٹیپ ریکارڈر لے کر دوبارہ حاضر ہوئے۔ مزاج پرسی کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مولانا سے عرض کیا:

مولانا! آپ نے مختلف دینی تحریکوں کو قریب سے دیکھا ہے اور بڑی بڑی شخصیتوں سے آپ کا جو بھی تعلق رہا ہے تو آج کی گفتگو میں اگر کوئی ایسی بات آئے جو ہمارے لئے مفید ہو اور وہ ریکارڈ ہو کر محفوظ بھی ہو جائے تو بہت سوں کے لئے بھی مفید ہوگی۔ ان شاء اللہ! مولانا مرحوم ومغفور نے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا۔ اسے ریکارڈ کر لیا گیا تھا۔ اس گفتگو نے ایک نوع

کے انٹرویو کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس کو قریباً لفظ بلفظ کیسٹ سے منتقل کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ البتہ ربط و تعلق کے لئے بعض باتیں توسین میں لکھی گئی ہیں۔

مولانا مرحوم و مغفور کی گفتگو میں بعض اکابر اور بعض دینی تنظیموں کے متعلق تنقیدی و اختلافی باتیں بھی آئی ہیں۔ یہ مولانا مرحوم کی ذاتی آراء ہیں جو بے کم و کاست پیش کی جا رہی ہیں ضروری نہیں کہ ڈاکٹر صاحب ان سے بالکلیہ متفق ہوں۔ مولانا کی اس گفتگو کا کیسٹ محفوظ کر لیا گیا ہے ــــ مولانا مرحوم نے ارشاد فرمایا:

"میری رائے یہ ہے کہ آپ (اپنے کام میں) اللہ کے فضل و کرم سے مخلص ہیں اور آپ نے اپنے اخلاص کا ثبوت دے بھی دیا ہے کہ کسی سے آپ کو کوئی عداوت نہیں ہے، کسی سے آپ کو کوئی رقابت نہیں ہے۔ آپ سب کا احترام کرتے ہیں۔ دین کے کام میں اہلِ علم و فضل کا تعاون چاہتے ہیں۔ لیکن آپ نے جب (کتاب و سنّت سے ماخوذ) ایک مرتبہ اپنے لئے ایک راستہ طے کر لیا ہے تو میرے خیال میں اب آپ بالکل اِدھر اُدھر مت دیکھئے کہ کون کیا کہتا ہے۔ کون اختلاف اور مخالفت کرتا ہے۔ آپ کا راستہ صحیح ہے۔ آپ اس پر (یک سوئی سے) چلیئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اِسے آپ کے لئے باعثِ اجر بنائے"۔

**ڈاکٹر اسرار احمد:** ــ جی ہاں۔ اس کے لیے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہوگی۔ باقی یہ کہ جو مختلف (دینی) تحریکیں چلی ہیں اس دور میں۔ ان کے بارے میں اگر آپ کا مختصر اظہارِ رائے ہو جائے تو وہ ہمارے لیے رہنمائی کا باعث ہوگا۔

**مولانا سعید اکبر آبادی:** ــ اس کے متعلق میں پہلے جو کچھ کہہ چکا ہوں، وہ بہت کافی ہے (مراد ہے وہ انٹرویو جو ۱۹ مارچ ۸۵ء کو لیا گیا تھا اور جو "میثاق" بابت مئی ۸۵ء میں صفحہ ۴۹ پر شائع ہو چکا ہے) آپ نے (مختلف تحریکوں کے متعلق) جو کچھ لکھا ہے، میں اس سے بالکل متفق ہوں۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی تحریک کے متعلق آپ نے صحیح لکھا ہے کہ وہ اس لیے نہ چل سکی کہ (وقت کے چند جیّد) علماء اس سے متفق نہیں ہو سکے۔ اور مولانا آزاد بد دل ہو گئے اور مولانا مودودی مرحوم کی تحریک کے متعلق میرا شروع میں خیال تھا جب تک کہ وہ سیاست کے میدان میں عملاً نہیں آئے تھے تو ان کی دعوت کا نہج ٹھیک ہی تھا اگرچہ اس میں تشتت تھا۔ لیکن جب وہ سیاست کے میدان میں آئے تو اُسی وقت سے میرا خیال تھا کہ انہوں نے اصل معاملہ بالکل الٹا کر دیا۔ سیاست بعد میں آتی ہے۔ دین جو آتا ہے وہ پہلے آتا ہے۔ انہوں نے سیاست کو دین پر مقدم کر دیا اور دین کا جو جائزہ لیا، اس کی تمام اچھائیوں کا اور اس کے محاسن کا وہ محض

سیاسی نقطۂ نظر سے لیا۔ تو (تقسیم ملک سے قبل) جب تک سیاسی کشمکش رہی تو اس وقت تک تو دین کو سمجھانے اور اس کو واضح کرنے کے لیے (انہوں نے) اچھا کام کیا۔ لیکن جب وہ سیاست ختم ہو گئی آزادی کے بعد تو انہوں نے (پاکستان میں) عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا جس میں ناکامی رہی۔ دین کا (اس کی حقانیت کو ثابت کرنے کا) کام پس منظر میں چلا گیا اسلام بطور نعرہ رہ گیا اس میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک تضاد پیدا ہو گیا۔ تو یہ معاملہ بالکل وہی ہے کہ اس طرح انہوں نے دین کو سیاست کے تابع کر دیا۔ (میرے خیال میں) یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ اسی طرح ہمارے یہاں (بھارت میں) مولانا وحیدالدین خاں کا معاملہ ہے جو "الرسالہ" نکالتے ہیں۔ انہوں نے اس کے بالکل برعکس معاملہ کر رکھا ہے اور وہ ہر چیز کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ یعنی اسلام کو محض ایک تبلیغی مذہب سمجھتے ہیں اور سیاست کو دین کا جزو ہی خیال نہیں کرتے —— رہی پاکستان میں جماعتِ اسلامی کی حصولِ اقتدار کی کوششیں —— حالانکہ اسلامی فتوحات یا تمکن فی الارض جس کا اللہ نے وعدہ کیا ہے۔ وہ تو بطورِ نتیجہ آتا ہے۔ اس کے لیے کوشش نہیں کی جاتی۔ تم نیک بن جاؤ۔ اللہ (کے دین) کا کام کرو۔ صحابہؓ کی طرح سے ہو جاؤ۔ خود بخود تم کو تمکن فی الارض بطور انعام حاصل ہو جائے گا۔ چونکہ بقاءِ اصلح (SUR-VIVAL OF THE FITTEST) جو ہے یہ عام قانون ہے۔ تم اگر با اصلاح ہو گے (مراد ہے صالح ہو گئے) تو اللہ نے خود یہ کہا ہے کہ یہ زمین جو ہے تو صالحون اس کے وارث ہوں گے۔ تو گویا مقصود بالذات نہیں ہوتی وہ چیز۔ بلکہ مقصود بالذات ہوتا ہے، انسان کو انسان بنانا اس کو مومن بنانا اس کو اللہ اور رسولؐ کا مطیع و فرمانبردار بنانا۔ لہٰذا تمکن فی الارض مومنین صالحین کو بطور انعام اور بطور نتیجہ ملتا ہے۔ نہ کہ یہ اسے آپ اپنا AIM اور اس کو اپنا مقصد بنا کر چلیں۔ تو یہ تحریکیں جو ہیں اسی وجہ سے ختم ہو گئیں بالکل —— اور بہت ساری تحریکیں جو کہ وقتی اور جزوی حالات کو سامنے رکھ کر چلی ہیں۔ جیسے کہ محمد ابن عبدالوہاب نجدیؒ کی تحریک بڑے زور و شور سے چلی۔ لیکن اس میں صرف مقامی حالات کی اتنی زیادہ رعایت کی ہے اور ان حالات کو رفع کرنے کے لیے اس قدر انتہائی STEP لیا کہ اس کا جو مقصد تھا وہ آگے چل کر ختم ہو گیا۔ تو یہ تمام تاریخ آپ کے سامنے ہے اور ماشاء اللہ آپ کا ذہن کھلا ہوا ہے۔ دل میں حوصلہ ہے۔ قلب میں وسعت ہے۔ ان سب چیزوں کو سامنے رکھ کر اگر آپ چلیں گے تو یقیناً اللہ تعالیٰ آپ کی نصرت اور آپ کی مدد فرمائے گا۔

**ڈاکٹر اسرار احمد:** — مولانا! کانگریس اور مسلم لیگ کی جو کشمکش تھی اس میں آپ نے بھی کوئی عملی حصہ لیا تھا یا نہیں!

**مولانا سعید احمد اکبر آبادی:** — میں نے اس میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔ میں کبھی کسی BODY کا ممبر نہیں رہا۔ کبھی نہیں۔ میں ان سب سے بالکل الگ تھلگ رہا۔

ڈاکٹر اسرار احمد:۔ اس زمانے میں آپ کہاں تھے یعنی ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک جب یہ کشمکش زیادہ زوروں پر تھی۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی:۔ میں دہلی میں تھا۔

ڈاکٹر اسرار احمد:۔ کیا ندوۃ المصنفین میں یا کسی مدرسہ میں بھی۔؟

مولانا سعید احمد اکبر آبادی:۔ فتحپوری مسجد میں دینی مدرسہ تھا۔ مدرسہ عالیہ کے نام سے۔ وہاں میں بہت پہلے سے مدرس تھا۔ وہاں مولوی فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات کی بھی تیاری کرائی جاتی تھی۔ وہیں رہتے ہوئے میں نے مختلف امتحانات دیئے انگریزی کے۔ پھر سینٹ اسٹیفن کالج سے میں نے ایم۔ اے کیا ایم۔ اے کرنے کے بعد کالج نے مجھے وہیں بلالیا۔

ڈاکٹر اسرار احمد:۔ ایم۔ اے آپ نے کس سن اور کس مضمون میں کیا تھا۔؟

مولانا سعید احمد اکبر آبادی:۔ میں نے ۱۹۳۶ء میں عربی میں ایم۔ اے کیا تھا اور پوری یونیورسٹی میں TOP کیا تھا اس کے بعد غالباً ۱۹۴۱ء میں انگریزی میں ایم۔ اے کیا جس کے بعد اس سینٹ اسٹیفن کالج نے مجھے مدعو کیا۔ جنرل محمد ضیاء الحق صاحب اسی زمانے میں وہاں طالب علم تھے۔ ۱۹۴۹ء تک میں وہیں رہا۔ اس کے بعد مجھے مولانا ابوالکلام آزاد نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کا پرنسپل بناکر بھیج دیا۔ وہاں تقریباً صفایا ہو گیا تھا۔ جس کے ہاتھ جو لگا وہ لے گیا۔ دس برس میں وہاں رہا۔ اس کے بعد مجھے علی گڑھ یونیورسٹی نے بلالیا۔ وہاں ڈین آف اسلامیات کی جگہ خالی ہوئی تھی۔ آخر تک میں وہاں رہا۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اللہ کے فضل و کرم سے پوری زندگی میں ایک جگہ کے علاوہ ہر جگہ مجھے خود ہی پیش کش ہوئی۔ ایک جگہ میں نے خود کوشش کی تو ناکام رہا۔ وہ تھی الٰہ آباد یونیورسٹی۔ وہاں شعبہ عربی کے پروفیسر کی جگہ خالی تھی۔ میں نے درخواست دی دو مرتبہ انٹرویو ہوا۔ میں تھا (عربی میں) فرسٹ کلاس فرسٹ — Through out First — اور میرے بالمقابل تھے ڈاکٹر سعید حسن۔ وہ تھے سیکنڈ کلاس۔ مگر یونیورسٹی نے ان کو لے لیا مجھے نہیں لیا۔ ڈاکٹر شفاعت خاں میرے والد کے بہت گہرے دوست تھے۔ میں نے ان سے ذکر کیا۔ تو انہوں نے جاکر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے جو شعبہ عربی کے سربراہ اور ڈاکٹر (شفاعت خاں) صاحب کے گہرے دوست تھے۔ کہا کہ آپ نے یہ کیا ستم کیا تو صدیقی صاحب نے کہا کہ سعید اکبر آبادی بہت قابل ہے لیکن ڈاکٹر سعید حسن میرا شاگرد ہے۔ میں تو انہی کو لوں گا صاف بات ہے۔ تو ڈاکٹر صاحب جب میں نے یہ دیکھا تو آپ یقین جانیئے کہ میں نے قسم کھالی کہ میں اب کبھی کہیں درخواست نہیں دوں گا۔ جبکہ اتنے بڑے لوگ بھی جانب داری برتتے ہیں۔ چنانچہ پوری زندگی گزر گئی کہ میں نے کبھی کسی جگہ کے لیے درخواست نہیں دی۔ اللہ نے جو جگہ بھی دی جو

مقام بھی دیا سب پیش کش تھیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد:۔ الہ آباد یونیورسٹی والی یہ بات کب کی ہے۔؟

مولانا سعید احمد اکبر آبادی:۔ (کچھ دیر سوچنے کے بعد) ۱۹۳۶ء میں، میں نے ایم۔اے کیا تھا عربی میں۔ یہ اغلباً سن ۳۸ یا ۳۹ کی بات ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد:۔ ہمارے ایک عزیز بھی وہاں رہے۔ ڈاکٹر زبیر احمد صاحب۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی:۔ ارے وہ تو میرے گہرے دوست رہے ہیں۔ بڑے صاحب علم اور بزرگ شخص تھے۔

ڈاکٹر اسرار احمد:۔ وہ میری والدہ کے حقیقی ماموں تھے۔ ایک اعتبار سے میرے نانا۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی:۔ ماشاء اللہ۔ بہت عمدہ۔ میں ان کو بہت قریب سے جانتا ہوں۔ بڑے اچھے آدمی تھے۔

ڈاکٹر اسرار احمد:۔ ان کے اصغر گونڈوی سے بڑے قریبی تعلقات تھے!

مولانا سعید احمد اکبر آبادی:۔ جی ہاں، جی ہاں۔ اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی اور میرے والد یہ تینوں پیر بھائی تھے۔ حاجی عبدالغنی مرحوم و مغفور منگلوری سے بیعت تھے۔

ڈاکٹر اسرار احمد:۔ کل آپ نے فرمایا تھا کہ مولانا علی میاں (مدظلہ) کا بھی مشورہ تھا کہ آپ علی گڑھ جائیں۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی:۔ جی ہاں۔ جب علی میاں کو علی گڑھ کی پیش کش کا علم ہوا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ میں علی گڑھ یونیورسٹی Join کر لوں میں (مدرسہ عالیہ سے) استعفیٰ دے کر گیا تھا کلکتہ سے، وہاں اس وقت جو گورنر اور چیف منسٹر تھے ان دونوں نے مجھے بہت روکا کہ آپ مت جائیے۔ ہمارا یہ مدرسہ بالکل تباہ ہو جائے گا تو میں نے کہا کہ میں نے جناب کرنل بشیر حسین زیدی صاحب سے جو وائس چانسلر تھے علیگڑھ یونیورسٹی کے۔ ان سے میں نے وعدہ کر لیا ہے اور میرے بعض بزرگوں کا بھی مشورہ ہے۔ کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں میری زیادہ ضرورت ہے۔ پھر مدرسہ عالیہ کا تقریباً بیڑا ہو گیا۔ وہاں کے لیے کوئی مناسب پرنسپل ملا ہی نہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد:۔ کس سن میں آپ کی علی گڑھ تشریف آوری ہوئی تھی؟

مولانا سعید احمد اکبر آبادی:۔ میں منتقل ہوا ہوں سن ۵۹ء میں۔ ۴۹ء میں کلکتہ گیا تھا۔ تقریباً دس سال سے زیادہ وہاں رہا۔

ڈاکٹر صاحب:۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا انتقال ہو چکا تھا جنہوں نے آپ کو وہاں بھیجا تھا!

مولانا: جی ہاں۔ مولانا آزاد کا ۲۲ فروری ۵۸ء کو انتقال ہوا تھا۔ مولانا آزاد نے مجھے جب مدرسہ عالیہ کلکتہ کا پرنسپل بنا کر بھیجا تھا تو فرمایا تھا کہ یہ آپ کی ٹریننگ کے لیے ہے۔ اس کے بعد میں آپ کو علی گڑھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنا کر بھیجوں گا۔ وہ مجھ سے اس قدر خوش تھے۔ وہ تو اللہ کو منظور نہ تھا۔ لیکن مجھے شعبۂ اسلامیات کی سربراہی کی پیش کش ہوئی تو میں نے اُسے منظور کر لیا..... میں خود بھی دیکھ رہا تھا کہ مسلمان کی نئی نسل بہت سے نئے (باطل) نظریات سے مرعوب ہوتی جا رہی ہے۔ اگر جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اپنے دین (کی حقانیت) پر اعتماد پیدا ہو جائے اور انہیں دعوت و تبلیغ کا صحیح نہج معلوم ہو جائے (صحیح استدلال کا سرا) ہاتھ آ جائے تو یہ دین کی بہت مفید خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ مجھے اپنے اُستاد حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ یاد نہیں کہ آپ کو پہلے سنایا یا نہیں سنایا۔ شاہ صاحبؒ امرتسر تشریف لے گئے۔ تو وہاں کشمیری خاندان کے ایک بہت بڑے بیرسٹر تھے محمد صادق۔ وہ دیسے دیندار آدمی تھے۔ وہ حضرت شاہ صاحبؒ سے ملنے آئے۔ لیکن وہ کلین شیو تھے اور سوٹ میں ملبوس۔ وہ شاہ صاحبؒ کے سامنے بڑے شرمائے شرمائے سے تھے۔ شاہ صاحب تاڑ گئے اور ان سے کہا کہ بھئی بیرسٹر صاحب! آپ میرے سامنے بیٹھے ہوئے کیوں شرما رہے ہیں! وہ چپ۔ شاہ صاحب نے کہا۔ اچھا اس لیے شرما رہے ہیں کہ آپکی داڑھی مونچھ صاف اور میری اتنی بڑی ڈاڑھی۔ یہ تو شرمانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس واسطے کہ میری ڈاڑھی بھی دُنیا کے لیے ہے۔ اگر آپ بیرسٹر ہو کر ڈاڑھی رکھیں تو کون آپ کو بیرسٹر سمجھ کر وکیل کرے گا۔ لوگ سمجھیں گے کہ یہ تو ملّا جی ہیں۔ یہ بیرسٹر کہاں سے ہو گئے۔ اور اگر میں مولانا صاحب ہو کر ڈاڑھی منڈوا دوں تو لوگ کہیں گے کہ یہ کہاں کے مولانا ہیں۔ یہ تو مسٹر ہیں۔ تو بھائی فعل اگرچہ مختلف ہے لیکن غرض ایک ہی ہے کہ دنیا میں پہچان ہو۔ کام ہو صرف اللہ (کی خوش نودی) کے لیے تو اس کا اجر ہے۔ تو یہ انداز تھا شاہ صاحب کی حکمت تبلیغ کا۔ حضرت والا ڈاکٹر صاحب بات اصل میں یہی ہے اور اصل قصہ یہی ہے کہ اگر آپ نے مولانا ہو کر دین کا کام کیا تو کیوں کیا؟ (اس لیے) کہ آپ کو تو روٹیاں اسی کی مل رہی ہیں۔ لیکن جو انگریزی تعلیم یافتہ لوگ ہیں وہ اگر یہ کام کر رہے ہیں۔ تو قدر و قیمت میں ان کی خدمات بہت آگے ہیں۔ اور عملی طور پر بھی مفید ثابت ہوں گی۔ اگر آپ جیسے تعلیم یافتہ حضرات کا دین کی خدمات کے لیے جو CONTRIBUTION ہے۔ وہ اگر نہ ہوتا تو آج کیا ہوتا۔ اندھیرا ہوتا۔ ہمارے علی میاں نے یہی بات کہی جو میرے دل میں بھی تھی کہ دین کی خدمت کسی کا کوئی اجارہ تو ہے نہیں اللہ کبھی (اپنے دین کا) بادشاہوں سے کام لیتا ہے۔ کبھی مجاہدوں سے کام لیتا ہے۔ کبھی صوفیائے سے کام لیتا ہے۔ کبھی علماء سے کام لیتا ہے کبھی آپ جیسے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں سے کام لیتا ہے۔

بالکل۔ جیسی ضرورت ہے اسی کے مطابق کام لیتا ہے۔ آج سائنس اور ٹیکنالوجی نے جو مسائل پیدا کر دیئے ہیں جو سوالات اٹھا دیئے ہیں۔ ان کو یہ بیچارے (عام) عالم لوگ کیا سمجھیں گے۔ (الاّ ماشاء اللہ) یہ تو بھی (جدید تعلیم یافتہ) لوگ ہی سمجھتے ہیں۔ اگر وہ دین بھی جانتے ہیں اور جدید (باطل) نظریات سے بھی واقف ہیں اور اللہ نے ان کو اتنی دیانت داری اور بصیرت بھی دی ہے کہ وہ دین کی تعلیمات کی روشنی میں ان کا توڑ کر سکتے ہیں پھر خود دین پر عمل کرتے ہیں۔ تو یہ ہے وقت کی اہم ترین ضرورت۔ آپ تو علی گڑھ ہو آئے ہیں تو آپ نے (ان کیفیات کو) دیکھا ہوگا۔؟

**ڈاکٹر صاحب** :۔ جی ہاں دو مرتبہ۔ علی گڑھ میں تبلیغی جماعت کو جس قدر مقبولیت حاصل ہوئی اُسے دیکھ کر مجھے حیرت آمیز خوشی ہوئی۔

**مولانا** :۔ جی ہاں تبلیغی جماعت بھی ہے۔ آپ کی جماعتِ اسلامی بھی ہے۔ لیکن اس کا اثر اب بہت کم ہو گیا ہے۔ تبلیغی جماعت کا اثر بہت زیادہ ہے۔ بہرحال وہاں تبدیلی آئی ہے خوشگوار تبدیلی۔ جو تعلیم یافتہ حضرات ذہین ہیں اور آزادانہ سوچ رکھتے ہیں ان میں سے بعض آپ کے فکر سے زیادہ قریب ہیں۔

**ڈاکٹر صاحب** :۔ آپ کی علامہ اقبال سے بھی ملاقاتیں رہی ہیں یا نہیں!

**مولانا مرحوم** :۔ جی ہاں ۱۹۳۱ء میں ان کے یہاں آنا جانا تھا۔ اس کو ملاقات تو نہیں کہہ سکتے۔ عبداللہ چغتائی کا ان کے یہاں بہت آنا جانا تھا۔ (دونوں میں) بہت بے تکلفی تھی۔ اور عبداللہ چغتائی سے میرا بہت دوستانہ تھا۔ میں انہی کے ساتھ کبھی کبھار علامہ کے یہاں جاتا تھا تو علامہ اقبال نے ان کو امام رازیؒ کی ایک کتاب دی جو چھپ کر آئی تھی المباحث المشرقیہ۔ علامہ کو زمان و مکان کی بحث سے بہت دلچسپی تھی۔ اس کتاب میں دو CHAPTERS تھے ایک زمان پر اور ایک مکان پر۔ تو علامہ نے چغتائی (صاحب) سے کہا کہ اس کا اردو میں ترجمہ کرا دو۔ چغتائی میرے پاس لے کر آئے اور مجھ سے کہا کہ ان کا ترجمہ کر دو تم تو دیوبند کا فارغ التحصیل تھا ہی۔ میں نے کہا لایئے۔ میں نے ترجمہ کر دیا۔ وہ ترجمہ (چغتائی صاحب نے) لے جا کر علامہ اقبال کو دکھلایا۔ تو وہ بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ یہ کون ہے جس سے تم نے یہ (ترجمہ) کرایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایک سعید صاحب ہیں یہاں اورینٹل کالج میں پڑھتے ہیں۔ دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں۔ تو انہوں نے مجھے بلا بھیجا۔ ان کو چونکہ حضرت انور شاہ کاشمیریؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ اور میں تلمیذِ خاص تھا حضرت شاہ صاحبؒ کا۔ تو جب علامہ کو اس نسبت کا علم ہوا تو وہ مجھ سے ہر ملاقات میں بڑی محبت سے پیش آتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب :۔ کیا علامہ اس کو عربی میں خود نہیں پڑھ سکتے تھے ۔ جبکہ علامہ نے خود ایم۔ اے عربی میں کیا تھا۔ ؟

مولانا مرحوم :۔ بات یہ ہے کہ کالج اور یونیورسٹیوں کی عربی کا معیار کوئی بہت اعلیٰ نہیں تھا۔

ڈاکٹر صاحب :۔ چٹائی توڑ عربی نہیں تھی ۔

مولانا مرحوم :۔ جی ہاں ۔ بات یہ ہے کہ عربی کی فلسفیانہ اصطلاحات تو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر بحث نہیں آتیں اور امام رازیؒ کی تمام فلسفیانہ اصطلاحات خالص دقیق عربی میں تھیں ۔

ڈاکٹر صاحب :۔ زمان کے مسئلہ پر تو (علامہ نے سمجھنا بہت چاہا ہے ۔ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے بھی اس (مسئلہ) پر ایک کتاب لکھی تھی ۔ ویسے علامہ کی ایک بات بہت نمایاں ہے کہ ان کا آخری وقت تک طالب علمانہ انداز رہا ہے۔ آخری وقت تک انہوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کشمیری کو بالکل طالب علمانہ انداز میں خطوط لکھے ۔ اسی طرح مولانا سلیمان ندویؒ کو بھی نہایت طالب علمانہ انداز میں خطوط لکھا کرتے تھے جب کہ علامہ مولانا سلیمان ندویؒ سے عمر میں خاصے بڑے تھے ۔

مولانا مرحوم :۔ ان میں بڑی نیازمندی تھی ۔ شروع میں جب شاہ صاحب کشمیریؒ لاہور آئے تو اس وقت تک ان کا علامہ سے میل جول نہیں تھا ۔ علامہ اقبالؒ نے شاہ صاحبؒ کی اپنے یہاں دعوت کی ۔ تو شاہ صاحب نے لکھ دیا کہ میں تمہارے یہاں کھانے پر نہیں آؤں گا ۔ چونکہ تو دیا نبوت کے متعلق تمہارے خیالات بہت زیادہ خراب ہیں ۔ علامہ نے لکھا کہ مجھے کچھ اشکالات ہیں ۔ شاہ صاحبؒ نے جواب بھجوایا کہ مجھے لکھ کر بھیجو ۔ (علامہ نے لکھ کر بھیجے) تو شاہ صاحبؒ نے ان کا (مدلل) جواب لکھا۔ علامہ نے جواب میں لکھا کہ میری تسلی ہو گئی ۔ میں اپنے سابقہ خیالات سے رجوع کرتا ہوں اور تائب ہوتا ہوں اور میں اس پر ایک مضمون انگریزی میں برائے اشاعت لکھ رہا ہوں ۔ تو علامہ شاہ صاحب کا اتنا لوہا مانتے تھے ۔

ڈاکٹر صاحب :۔ یہ تو بہت اہم واقعہ ہے شاید لوگوں کے علم میں نہ ہو ۔

مولانا مرحوم :۔ جی ہاں ۔ میرا خیال ہے کہ وہ مضمون کہیں شائع بھی ہوا ہے ۔

ڈاکٹر صاحب :۔ علامہ نے شاہ صاحب سے بڑی مؤدبانہ درخواست کی کہ آپ لاہور تشریف لے آئیں جب شاہ صاحب ڈابھیل جا رہے تھے کہ فقہ اسلامی کی نئی تدوین میں اور آپ مل کر کریں لیکن اللہ کو منظور نہیں ہوا ورنہ وہ کام بہت اعلیٰ ہو جاتا ۔

مولانا مرحوم :۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بعد علامہ بیمار بھی تو ہو گئے اور وہ اس قابل نہیں رہے

کہ کام کر سکیں اور اس کی کوئی تنظیم (بھی) نہیں ہو سکی۔ اُدھر ڈابھیل سے آفر آئی ہوئی تھی لہذا (شاہ صاحب) وہاں چلے گئے۔ اگر وہ کام ہو جاتا تو بڑی شاندار چیز ہوتی۔

**ڈاکٹر صاحب**:۔ مولانا اگر مناسب سمجھیں تو ذرا یہ بتا دیجئے کہ یہ کیا مسئلہ تھا! کیوں ڈابھیل جانا پڑا حضرت شاہ صاحبؒ کو؟

**مولانا مرحوم**:۔ ڈابھیل اس لیے جانا پڑا کہ اصل میں بات یہ تھی کہ دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ نے دارالعلوم کو اپنی ذاتی جائداد سمجھ کر اُسے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس میں اقربا پروری کا بہت دخل ہو گیا تھا۔ منتظم اعلیٰ حافظ محمد احمد صاحب مرحوم نے جو قاری محمد طیب مرحوم کے والد تھے اپنے ایک قریب ترین عزیز کو ناظم مطبخ بنانے کے بعد آپ نے ان کو سپلائی کا ٹھیکہ بھی دے دیا۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ بھئی یہ کیا تک ہے! وہ ناظم مطبخ بھی ہیں، ملازم بھی ہیں اور ٹھیکیدار بھی ہیں۔ یہ تو بڑی بے تکی بات ہوئی۔ یہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس (بات) کا بہت بُرا منایا گیا۔ اس پر شاہ صاحب نے اس روز عصر کی نماز دارالعلوم کی مسجد میں پڑھی اور نماز کے بعد کہا کہ لوگو! ذرا ٹھہر جاؤ۔ لوگ رُک گئے تو شاہ صاحبؒ نے اس وقت یہ حدیث پڑھی: اَلْوَقْفُ لَا یُمْلَکُ ۔ یہ دارالعلوم جو ہے وقف ہے۔ کسی کی ذاتی جائداد نہیں ہے کہ آپ جس طرح چاہیں، اُسے استعمال کریں۔ آپ نے شوریٰ کو بیکار کر رکھا ہے اور مطبخ کا جو نیا انتظام کیا گیا ہے وہ میں برداشت نہیں کروں گا۔ بس بات بڑھی اور اسی (بات) پر استعفیٰ دینے کی نوبت آگئی۔

**ڈاکٹر صاحب**:۔ آپ نے مولانا آزاد کے دارالعلوم دیوبند کے داخلے پر پابندی کے سلسلہ میں جو واقعہ سنایا تھا کہ جب (کانپور کی مسجد کے شہید کرنے کے بعد علماء کو مطمئن کرنے کے لیے) گورنر یوپی دارالعلوم دیوبند آیا تھا تو انتظامیہ نے مولانا آزاد کا داخلہ دارالعلوم میں روک دیا تھا اس پر حضرت شیخ الہندؒ نے بھی بطور احتجاج اس جلسہ میں شرکت نہیں کی تھی تو اس کا ذکر جب مولانا عزیر گل صاحب کے سامنے ہوا تو انہوں نے سختی سے اس کی تردید اور نفی کی کہ ان کے علم میں نہیں ہوگا۔

**مولانا مرحوم**:۔ یہ تو مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے سامنے کا واقعہ ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا اور بہت سے لوگوں نے اس کی توثیق کی۔

**ڈاکٹر صاحب**:۔ میں مزید حیران ہوا کہ مولانا عزیر گل صاحب شیخ الہندؒ کے خدام میں سے ہیں اور ان کے علم میں یہ واقعہ بھی نہیں ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے لیے (حضرت شیخ الہندؒ) کی طرف سے امام الہندؒ بنانے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی کوئی تجویز تھی؟

**مولانا**:۔ حیرانی کی بات تو ہے۔ ورنہ یہ تو بہت مشہور بات ہے۔ شاید مولانا (عزیر گل) بھول

گئے ہوں۔ ان کی عمر بھی تواب کافی ہو گی۔

ڈاکٹر صاحب :۔ لیکن میری توجیہ یہ ہے کہ غالباً وہ (مولانا عزیر گل صاحب) نوجوان خدام میں سے تھے۔ اس لیے ان معاملات میں وہ شریک نہیں ہوتے ہوں گے اس لیے یہ واقعہ ان کے علم میں نہ آیا ہو۔

مولانا مرحوم :۔ جی ہاں۔ یہ توجیہ صحیح ہے۔ وہ خدام ہی میں سے تھے۔

ڈاکٹر صاحب :۔ لیکن اب وہ خدام میں سے شاید آخری شخص ہیں جو بفضلہٖ تعالیٰ بقید حیات ہیں اس لیے ان کو ایک تبرک کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔

مولانا مرحوم :۔ جی ہاں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ یہ بات تو تواتر کے درجہ کو پہنچی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب :۔ مجھے تو اس سے بھی زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے جو سوانح حضرت شیخ الہندؒ کی لکھی ہے اس میں مرض وفات کا ذکر بھی ہے۔ اس کی ساری تفاصیل کا ذکر بھی ہے۔ لیکن اس واقعہ کا انہوں نے بھی ذکر نہیں کیا۔ (یعنی) مولانا آزاد کو امام الہندؒ بنانے کے مسئلہ کا۔ اس کا افسوس ہوا۔ غالباً وہ جو معاصرت ہے وہ بنیاد بنی ہے۔

راقم الحروف :۔ البتہ مولانا محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب :۔ لیکن مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا اس اہم واقعہ کا بالکل ہی ذکر نہ کرنا۔ اس کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔؟ سمجھ میں نہیں آتا۔

مولانا مرحوم :۔ وہ غالباً مولانا ابوالکلام آزاد کی رعایت کر گئے کہ ان کو ناگوار نہ ہو ورنہ یہ تو بالکل کھلی بات ہے۔ مشہور و معروف بات ہے۔

ڈاکٹر صاحب :۔ مولانا آپ نے اپنی پچھلی گفتگو میں (مراد ہے مولانا کا انٹرویو شائع شدہ میثاق بابت مئی ۸۵) "تلفیق بین المذاہب" کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ تو اب کرنا ہی ہو گا۔ اس کے بغیر تو کام نہیں چلے گا تو یہ لفظ کہاں سے بنا ہے۔ ل۔ ف۔ ق کا اصل مفہوم کیا ہے؟

مولانا مرحوم :۔ تلفیق۔ لفق (سے بنا ہے) لفق کے معنی ہیں ملا دینا۔

ڈاکٹر صاحب :۔ اس مادہ سے قرآن و حدیث میں تو کوئی لفظ آتا نہیں۔ میں نے تحقیق کر لی ہے۔

مولانا مرحوم :۔ شاید ایسا ہی ہو۔ لیکن تمام مستند لغات عربی میں یہ لفظ مل جائے گا۔ اور ہمارے بعض متقدمین علماء نے تلفیق بین المذاہب کو استعمال کیا ہے اور اس کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب :۔ ہمارے بعض علماء تو اس تلفیق کو بہت بڑی گالی خیال کرتے ہیں۔ گویا کہ ان کے نزدیک (تو) یہ درجہ کفر تک پہنچی ہوئی بات ہے۔!

مولانا مرحوم :۔ ہمارے نزدیک تمام ائمہ فقہا سب برابر ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے (تلفیق بین المذاہب) کی ہے۔ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے۔ اور مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تک نے کی ہے۔ مولانا تھانویؒ نے بہت سے علماء کو بلا کر لکھا تھا: "اَلْحِیلَةُ النَّاجِزَةُ لِلْحَلِیلَةِ الْعَاجِزَةِ" بتلایئے یہ سب کیا ہے! دیکھا کہ کسی مسئلے میں ... فقہ حنفی پر عمل کرنے سے نقصان ہوگا۔ تو اسے چھوڑ کر امام مالکؒ کے مذہب کو اختیار کرنے کا فتویٰ دیا۔ اور بہت سے علماء کو بلا کر دکھا دیا۔ بولیے یہ کیا ہے! یا مفقود الخبر کے بارے میں فقہ حنفی کا فتویٰ چھوڑ کر امام احمد ابن حنبل کے فتوے پر فیصلہ طے کیا۔ تو برابر یہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب :۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ مولانا تھانویؒ یہ کر سکتے تھے۔ تم کون ہوتے ہو یہ کرنے والے! میں نے عرض کیا کہ ٹھیک ہے میرا تو یہ مقام نہیں ہے لیکن اصولاً تو بہرحال ایک بات سامنے آگئی۔

مولانا مرحوم :۔ آپ یہ کہتے کہ مولانا تھانویؒ بھی تو مشتبہ ہیں علماء کے ایک کثیر حلقہ کے نزدیک — اس کے بغیر تو جناب والا چارا ہے ہی نہیں۔ اس کے بغیر (یعنی تلفیق بین المذاہب کے بغیر) ایک صحیح اسلامی ریاست چل ہی نہیں سکتی —

ڈاکٹر صاحب :۔ میں نے آپ کی سب سے پہلے کتاب حقیقتِ وحی طالب علمی کے زمانے میں پڑھی تھی۔

مولانا مرحوم :۔ کتاب کا اصل نام ہے "وحی الٰہی" پھر ہے "فہم قرآن"

ڈاکٹر صاحب :۔ میں نے یہ دونوں ایک ساتھ لی تھیں۔ دونوں کا بہت شوق سے مطالعہ کیا تھا۔ مجھے چونکہ قرآن حکیم سے اللہ کے فضل و کرم سے زمانہ طالب علمی ہی میں گہرا شغف ہو گیا تھا تو قرآن سے متعلق جو بھی کسی مستند عالم دین کی کوئی چیز مل جاتی تھی، اس کا میں بڑے ذوق و شوق سے مطالعہ کیا کرتا تھا۔ آپ کی تاریخ اسلام سے متعلق کتابیں میں نے کم ہی پڑھی ہیں — یہاں (پاکستان میں) آپ کی تصانیف کون شائع کر رہا ہے ؟

مولانا مرحوم :۔ صاحب! کیا عرض کروں! میں نے کئی جگہ مختلف ناشروں کی طرف سے شائع کردہ یہاں اپنی کتابیں دیکھی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب :۔ کیا یہ سب بلا اجازت ہو رہا ہے۔؟

مولانا مرحوم :۔ سب بلا اجازت۔ کسی نے ایک پیسہ آج تک نہیں دیا۔ نہ اجازت لی۔

میں پہلے جب پاکستان آیا تھا تو جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کو بطور ہدیہ دینے کے لیے میں چند کتابیں خریدنے کے لیے ایک صاحب کے ساتھ بازار گیا تو کئی جگہ دیکھا کہ میری کتابیں بھی رکھی ہوئی ہیں ۔ تو ایک جگہ ان صاحب نے میرے متعلق بتا بھی دیا کہ فلاں فلاں کتاب کے مصنف سعید احمد اکبر آبادی یہ ہیں۔ اس کے باوجود کوئی اثر نہیں ہوا اور میری کتابوں کے مجھ سے پُورے دام لیے گئے ۔ تو لیجے یہ حالت ہے ۔ اپنی کتابیں خریدنی پڑیں۔

**ڈاکٹر صاحب :۔** اگر آپ ہمیں اجازت دیں تو ہم آپ کی کتابیں چھاپیں۔

**مولانا مرحوم :۔** بڑے شوق سے ۔ بڑے شوق سے ۔ میری کتاب ہے 'صدیق اکبرؓ' اور ابھی آرہی ہے "عثمان غنی ذوالنورینؓ"۔

**ڈاکٹر صاحب :۔** میں یہ دونوں کتابیں دہلی سے خرید کرکے آیا تھا ۔ اسی موقع پر مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کو بھی دیکھ آیا تھا ۔ وہ بے ہوشی یا گہری نیند کی حالت میں تھے ۔ بہرحال مجھے ان کو دیکھنے کی اجازت مل گئی تھی ۔ میں ان کو دیکھ آیا تھا ۔

**مولانا مرحوم :۔** میری کتاب 'صدیق اکبر' کسی نے یہاں 'الفیصل اکیڈمی' کی طرف سے چھاپ دی ہے ۔

**ڈاکٹر صاحب :۔** مولانا! تبلیغی جماعت کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے ۔؟

**مولانا مرحوم :۔** تبلیغی جماعت! میں نے کہا نا کہ اچھا کام کر رہی ہے ۔ لیکن اس پر ہم پورا Depend نہیں کر سکتے ۔ اور چونکہ مجھے اس سے دلچسپی رہی نہیں ۔ اس لیے میں نے زیادہ سوچا نہیں ۔ اس سے اگر فائدہ ہو رہا ہے تو اچھا ہے ۔

**ڈاکٹر صاحب :۔** لیکن یہ کہ انہوں نے نہی عن المنکر کا راستہ بالکل بند کر رکھا ہے .... اس کو بالکل نظر انداز کر رکھا ہے ۔ یہ تو دین کے لیے بہت مُضر ہے ۔

**مولانا مرحوم :۔** یہی تو میں نے پہلے کہا تھا اور کل بھیؔ ۔ بہرحال اب وہ اسی پر قانع ہو بیٹھے ہیں ۔ پھر اب

---

لہ مولانا مرحوم نے اپنی جس پہلی رائے کا حوالہ دیا ہے وہ میثاق بابت مئی کے انٹرویو میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہے "میرا ذاتی خیال ہے کہ تبلیغ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے درمیان عام و خاص کی نسبت ہے ۔ یعنی جہاں کہیں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پایا جائے گا وہاں تبلیغ ضرور ہو گی لیکن جہاں محض تبلیغ ہو وہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہونا ضروری نہیں ہے"۔

(میثاق مئی ۸۵ ص۱۵) (مرتب)

ان میں تحزب بھی بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ بہت ہی زیادہ۔

ڈاکٹر صاحب :۔ آپ نے کل مولانا بنوری صاحبؒ کا واقعہ سنایا تھا۔[1]

مولانا مرحوم :۔ جی ہاں، جی ہاں ایک نہیں دسیوں واقعات ہیں۔ یہ لوگ اپنے سوا کسی کو حق پر سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ ان میں تحزب و تخالف بہت بڑھ چکا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ (مزید براں) حضرت مولانا شاہ وصی اللہ خاں الٰہ آبادی کے ایک مرید خاص ہیں۔ بہت بڑے مولانا۔ بہت بڑے عالم۔ اور بڑے گوشہ نشین اور بہت خاموش طبیعت۔ انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے تبلیغی جماعت کے اوپر۔ اور بڑی سخت تنقید کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ تم بریلویوں کو کہتے ہو کہ بدعتی ہیں۔ اور اس لیے کہتے ہو کہ جو چیز مباح ہے اُس کو انہوں نے سُنت، واجب اور فرض قرار دیدیا۔ لیکن تم جو کچھ کر رہے ہو یہ سب بدعات ہیں۔ تم نے اہم دینی اصطلاحات کے معنی اور مفہوم ہی بدل کر رکھ دیئے ہیں۔ انہوں نے بڑی سخت تنقید کی ہے۔ میں نے مولانا محمد منظور نعمانی صاحب سے پوچھا تھا کہ حضرت ہے (اس کا آپ کے پاس) کوئی جواب! بولے کوئی جواب نہیں۔

ڈاکٹر صاحب :۔ مولانا نعمانی نے یہ فرمایا کہ کوئی جواب نہیں؟

مولانا مرحوم :۔ جی ہاں! یہی کہا مولانا نے۔ صاحب کتاب نے قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ ان کا جو طریقۂ عمل ہے وہ قطعاً غیر شرعی ہے۔ حدیث نے جس چیز کو لازم نہیں کیا اس چیز کو انہوں نے لازم کر دیا ہے۔ اور جناب والا۔ نہی عن المنکر بالکل نہیں کرتے جبکہ حدیث میں اس کی اتنی تاکید ہے پھر انہوں نے گشت کو چلہ کو واجب کا درجہ دے رکھا ہے۔ انہوں نے سینکڑوں مثالیں بیان کی ہیں۔ آج ایک لڑکے کی شادی ہوئی ہے۔ کل اس سے کہا کہ تبلیغ کے لیے چلو لندن اور وہ چلا گیا۔ تو بولے یہ شریعت کا کہاں حکم ہے۔! دین اعتدال اور توازن کی تعلیم کا نام ہے۔

ڈاکٹر صاحب :۔ تبلیغی جماعت کو اصل میں مولانا علی میاں اور مولانا محمد منظور نعمانی کی شرکت کی وجہ سے کافی شہرت .....

مولانا مرحوم :۔ مولانا علی میاں بھی تو ہٹ گئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب :۔ مولانا علی میاں کے متعلق تو معلوم ہوا تھا کہ وہ تبلیغی جماعت سے کچھ مایوس ہیں، لیکن مولانا محمد منظور نعمانی کے متعلق.....

---

[1] اس واقعہ کا آگے ذکر آئے گا۔ (مرتب)

مولانا مرحوم :۔ جی وہ بھی ہٹ گئے۔ علی میاں نے تو صاف لکھ دیا اپنی سوانح عمری "کاروانِ زندگی" میں کہ میں نے راستہ بدل دیا ہے۔ میں نے بہت چاہا کہ یہ لوگ اصلاح کریں مگران لوگوں نے میری بات کو نہیں مانا۔ تو میں نے اپنا راستہ الگ کر دیا۔ میں نے کہا تھا ان سے کہ کتاب وسنّت کی روشنی میں آپ اپنی دعوت کا نہج اور طریقِ کار تبدیل کریں۔ لیکن ان حضرات نے میرے دلائل تسلیم نہیں کیے۔ وہ مطمئن نہیں ہو سکے جب کہ میرا اطمینان بھی ختم ہو چکا تھا۔ لہذا میں نے یہی مناسب سمجھا کہ میں ہٹ جاؤں۔

ڈاکٹر صاحب :۔ مجھے اتنی تفصیل سے یہ بات معلوم نہیں تھی۔ ان شاء اللہ جلد ہی وقت نکال کر میں ان کی کتاب 'کاروانِ زندگی' کا مطالعہ کروں گا۔

راقم الحروف :۔ مولانا۔ آپ کی یہ محبت وشفقت ہے کہ بیماری وضعف کے باوجود کل بھی آپ نے کافی اہم اور قیمتی باتیں ارشاد فرمائیں اور اپنے تجربات سے مستفید فرمایا اور آج بھی نہایت بیش بہا خیالات اور اہم واقعات ریکارڈ کرائے۔ اب آپ سے درخواست ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے لیے کچھ نصیحت فرمائیں۔

مولانا مرحوم :۔ ارے میں کیا اور میری نصیحت کیا۔ ہم تو ان سے نصیحت حاصل کرنے کے لیے آئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب :۔ مولانا۔ میرے لیے آپ کی نصیحت بہت قیمتی چیز ہوگی۔ . . .

مولانا مرحوم :۔ بس یہی ہے کہ آپ اللہ پر توکّل کرتے ہوئے اپنا کام کیے جایئے۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اخلاص کے ساتھ اسی کو کرتے رہیے۔ صرف رضائے الٰہی آپ کا نصب العین سامنے رہنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ اس کام میں برکت عطا فرمائے۔ اس کو آخرت میں شرف قبولیت عطا فرمائے۔ اس کو آخرت میں آپ کے لیے توشہ بنائے میں دعا ہی کر سکتا ہوں۔ جبکہ دل تو یہ چاہتا ہے کہ صحت اجازت دے تو جتنا بھی تعاون ممکن ہو وہ پیش کروں۔

ڈاکٹر صاحب :۔ میرے لیے آپ کا یہ فرمانا ہی سرمایۂ زیست رہے گا۔ ان شاء اللہ۔

---

اس طرح قریباً ایک گھنٹہ تک یہ مبارک مجلس جاری رہی اور ہم مولانا سے ملاقات کر کے رخصت ہوئے۔ کسے خبر تھی کہ راقم کی یہ آخری ملاقات ثابت ہوگی۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝

# استدراک

۲۳/ اپریل ۸۵ کی جناب مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم و مغفور اور محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کے مابین گفتگو ریکارڈ کر لی گئی تھی۔ جو کیسٹ سے قریباً لفظ بلفظ منتقل کر کے شامل اشاعت کی گئی ہے۔ قارئین کرام نے اس کا مطالعہ فرما لیا ہوگا — ۲۲/ اپریل ۸۵ کی ملاقات کے موقعہ پر مولانا مرحوم نے تفصیل سے چند اہم باتیں بتائی تھیں اور چند اہم واقعات سنائے تھے۔ چونکہ اس موقعہ پر ٹیپ ریکارڈر ساتھ نہیں تھا۔ لہذا اس روز کی گفتگو ریکارڈ نہیں ہو سکی۔ اس گفتگو کے بعض نکات ۲۳/ اپریل والے انٹرویو میں مجمل اشارات کے طور پر آئے ہیں۔ راقم الحروف اپنی یادداشت سے ۲۲/ اپریل کی گفتگو کے چند اہم نکات قلم بند کر رہا ہے۔ مولانا مرحوم کے ارشادات بالمعنی تحریر کیے جا رہے ہیں۔ الفاظ مولانا مرحوم کے نہیں ہیں۔ البتہ راقم کو بفضلہٖ تعالیٰ اطمینان ہے کہ مفہوم و مدعا مولانا مرحوم ہی کا ہے۔ مولانا کے ارشادات و خیالات ترتیب وار لکھے جا رہے ہیں۔

● — مولانا مرحوم نے ڈاکٹر صاحب سے فرمایا: "میں آپ کی کچھ کتابیں پہلے بھی پڑھ چکا تھا اور کچھ کراچی کے موجودہ قیام کے دوران پڑھی ہیں۔ ماشاءاللہ آپ کا فکر صحیح ہے۔ قرآن و سنت سے ماخوذ ہے۔ آپ اخلاص کے ساتھ اپنا کام کیے جائیے۔ اِدھر اُدھر نہ دیکھیے۔ ہمارے معاشرہ کے بگاڑ کے بہت سے اسباب ہیں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے اکثر علماء کرام میں رواداری نہیں رہی۔ ان میں تحزب ہے۔ کوئی شخص الا ماشاءاللہ اپنے حلقہ کے سوا دوسرے کی بات پر غور کرنا تو کجا کان دھرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا بلکہ بعض حضرات نہایت فروعی معاملات کا تعاقب کرتے ہیں اور ان کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ دین کی اصل حقیقت ان فروعات کے پردے میں چھپ جاتی ہے۔ جس حلقہ کے علماء کی عظیم اکثریت نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کو عالم دین نہیں مانا ان کی نظر میں بھلا آپ کی حیثیت کیا ہو سکتی ہے!۔ جو شخص بھی دین کا بنیادی اور ٹھوس کام لے کر اٹھتا ہے۔ دعوت دیتا ہے اور اس کی دعوت کے اثرات ظاہر ہونے شروع ہوتے ہیں تو اُسے ایسے حالات سے سابقہ پیش آتا ہی ہے جیسے آپکو پیش آ رہے ہیں آپ اس سے کوئی اثر نہ لیں۔ اپنا کام کرتے رہیں۔ آپ اپنے اخلاص اور محنت کا اجر اللہ کے یہاں محفوظ پائیں گے۔

● — تبلیغی جماعت کے متعلق مولانا مرحوم نے فرمایا: تبلیغی جماعت ابتدائی چند سالوں تک تحزب سے پاک رہی ہے۔ اس کام کے محرک حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ بڑے اللہ والے شخص تھے۔ بڑے وسیع القلب

تھے۔ بڑے منکسر المزاج اور متواضع شخصیت تھے۔ نہایت متقی و متدین تھے۔ مسلمانوں کی دینی و اخلاقی پستی پر نہایت کرب اور تکلیف محسوس کرتے تھے۔ نہایت مضطرب رہتے تھے۔ نہایت بے نفس اور مخلص انسان تھے۔ اغلباً سن ۴۴ء کا واقعہ ہے جبکہ ان کے کام کو تین چار سال گزرے تھے۔ وہ دہلی کے محلہ کشن گنج کی ایک مسجد میں اپنے چند قریبی ساتھیوں کے ساتھ تشریف لائے۔ مقصد لوگوں کو دین کی دعوت دینا اور اپنے کام سے متعارف کرانا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تو میں بھی بغرض استفادہ پہنچ گیا۔ مغرب کی نماز وہیں مولانا رحمۃ اللہ کی اقتداء میں پڑھی۔ مولاناؒ نے جب مجھے دیکھا تو خود ہی پیش قدمی کرکے میرے پاس تشریف لائے بڑی محبت و شفقت اور تپاک سے ملے اور گلے لگایا۔ اور فرمایا کہ "تم نے آکر میرا کام آسان کر دیا۔ اب میرے بجائے تم تقریر کرو گے۔" میں نے عرض کیا کہ حضرت! میں تو آپ کے ارشادات سے مستفید ہونے آیا تھا۔ آپ کی موجودگی میں میں تقریر کروں! یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ دوسرے لوگ بھی آپ کا وعظ و نصیحت سننے آئے ہیں وہ بھی مایوس ہوں گے۔ فرمانے لگے۔ "بھائی مجھے تقریر کرنی کب آتی ہے یہ تو اللہ تعالیٰ نے ایک جذبہ اور ایک تڑپ ایک لگن دل میں پیدا کر دی ہے جو مجھے کشاں کشاں مختلف جگہوں پر لے جاتی ہے۔ تقریر تم ہی کرو گے۔" میں نے بہت معذرت چاہی۔ لیکن مولاناؒ نے میری ایک نہیں سُنی۔ امتثال امر میں مجھے تقریر کرنی پڑی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے "دین کے تقاضے" کے موضوع پر ایک گھنٹہ تقریر کی۔ تقریر کے بعد مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے گلے لگایا اور میرے رخسار کا بوسہ لیا۔ بعد میں صرف چند منٹ میں مولاناؒ نے میری تقریر کی تصویب فرمائی اور مختصر طور پر اپنے تبلیغی کام سے متعارف کرایا۔

● — مولانا مرحوم نے بعدہ فرمایا۔ "آپ نے یہ واقعہ سن لیا۔ اب دوسرا ایک اہم واقعہ سنیئے یہ غالباً ۱۹۷۳ء کی بات ہے کہ مجھے جنوبی افریقہ سے ڈربن یونیورسٹی سے چند لیکچرز دینے کے لیے دعوت نامہ آیا اور میں وہاں چلا گیا۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ ڈربن سے تقریباً دس میل دور ایک مضافاتی بستی میں تبلیغی جماعت کا ایک بہت بڑا اجتماع ہو رہا ہے۔ میں استفادہ کے خیال سے وہاں چلا گیا۔ پاکستان سے مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور کہنے لگے کہ اب جبکہ تم آگئے ہو تو تم کو آج کے اجتماع میں تقریر کرنی ہوگی۔ میں نے معذرت کی لیکن مولاناؒ اصرار فرمانے پر مُصر رہے۔ مجھے بالآخر ہتھیار ڈالنے پڑے۔ مولانا مرحوم مجھے لے کر منتظمین کے پاس پہنچے۔ میرا تعارف کرایا اور منتظمین سے کہا کہ آج کے پروگرام میں میری تقریر بھی شامل کریں۔ منتظمین نے پہلے تو مختلف عذرات پیش کیے۔ لیکن جب مولانا بنوریؒ نے زیادہ اصرار کیا تو صاف طور پر جواب ملا کہ "مولانا! ہم نے یہ پالیسی طے کر رکھی ہے کہ ہم اپنے پلیٹ فارم سے کسی ایسے صاحب کو تقریر کی اجازت نہیں دیں گے جو ہمارے کام سے مکمل اتفاق نہ رکھتا ہو اور عملاً"

ہمارے کام میں شریک نہ ہو" مولانا بنوریؒ نے پھر اصرار کیا کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں کہیں گے جو اختلافی ہو۔ یہ تو دین کی دعوت ہی پیش کریں گے"۔ لیکن منتظمین کسی طرح تیار نہیں ہوئے۔ مولانا بنوریؒ کی بات بھی نہیں مانی ۔ یہ ۳۰ء کا واقعہ ہے جو میرے ساتھ پیش آیا۔ اب تو تحزب اور بھی پختہ ہوگیا ہے ۔ ایسے دسیوں واقعات میرے علم میں ہیں کہ یہ حضرات دوسرے علماء کو کس نظر سے دیکھتے ہیں ۔میرے علم میں یہ بات بھی ہے کہ یہ لوگ اپنے متوسلین کو باقاعدہ منع کرتے ہیں کہ دوسرے علماء کے مواعظ اور قرآن کے دروس میں شرکت نہ کیا کریں۔

● ۔۔۔ مولانا مرحوم نے فرمایا "میرا اندازہ ہے کہ جنوبی افریقہ کے اس اجتماع میں دس ہزار سے بھی متجاوز حضرات شریک تھے۔ پاکستان، بھارت اور افریقہ کے مختلف ممالک سے اُردو بولنے اور سمجھنے والے لوگ آئے ہوئے تھے۔ چار پانچ روز کا اجتماع تھا۔ بڑے معقول انتظامات تھے ۔ میں نے منتظمین میں سے ایک صاحب سے جو میرے کچھ زیادہ قریب ہو گئے تھے دریافت کیا کہ ان انتظامات پر اندازاً کیا خرچ آتا ہوگا تو انہوں نے بتایا کہ تقریباً پندرہ ہزار ڈالر روزانہ ۔۔۔ میں نے پوچھا کہ فنڈز کا انتظام کیسے ہوتا ہے تو جواب ملا کہ جنوبی افریقہ کے کوئی بڑے سیٹھ ہیں ۔ انہوں نے تمام اخراجات اپنے ذمہ لیے ہوئے ہیں ۔ میں نے دل میں سوچا کہ شاذ اور انتہائی ضعیف احادیث اور بزرگوں کے اقوال سے فضائل کا جو فلسفہ اختیار کیا گیا ہے اس اعتبار سے سیٹھ صاحب کا یہ مالی تعاون ان کے لیے تو آخرت میں بڑے اعلیٰ مقامات کے حصول کا ذریعہ بنے گا۔

● ۔۔۔ مولانا مرحوم نے فرمایا "مجھے جس بات کا سب سے زیادہ افسوس ہوتا ہے وہ یہ کہ ان حضرات نے نہی عن المنکر کو اپنے پروگرام سے بالکل خارج کر رکھا ہے ۔ دین کے اعتبار سے یہ بہت خطرناک ہے۔ پھر یہ کہ قرآن کا تو ان کی تقریروں اور گفتگوؤں میں حوالہ شاید ہی ملے۔ حدیثوں کا بھی صرف مطلب بیان ہوتا ہے وہ زیادہ تر فضائل سے متعلق ہوتی ہیں یا پھر عذابِ جہنم سے یہ آخری بات تو بہت پسندیدہ ہے لیکن ان کا زیادہ زور بزرگوں کے فرمودات پر ہوتا ہے ۔ اور بزرگوں سے منسوب کر کے یہ بڑی عجیب عجیب باتیں کہا کرتے ہیں ۔بہرحال اگر جماعت کو دین کا صحیح فکر اور فہم مل جائے تو یہ ایک بڑی مؤثر طاقت بن سکتی ہے ۔ہم دعا ہی کر سکتے ہیں کہ یہ جو افرادی قوت پیدا ہو رہی ہے یہ صحیح طور پر اسلام کے لیے لگ جائے ۔۔۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرمائے ۔ (ج ۔ ر)

✻✻

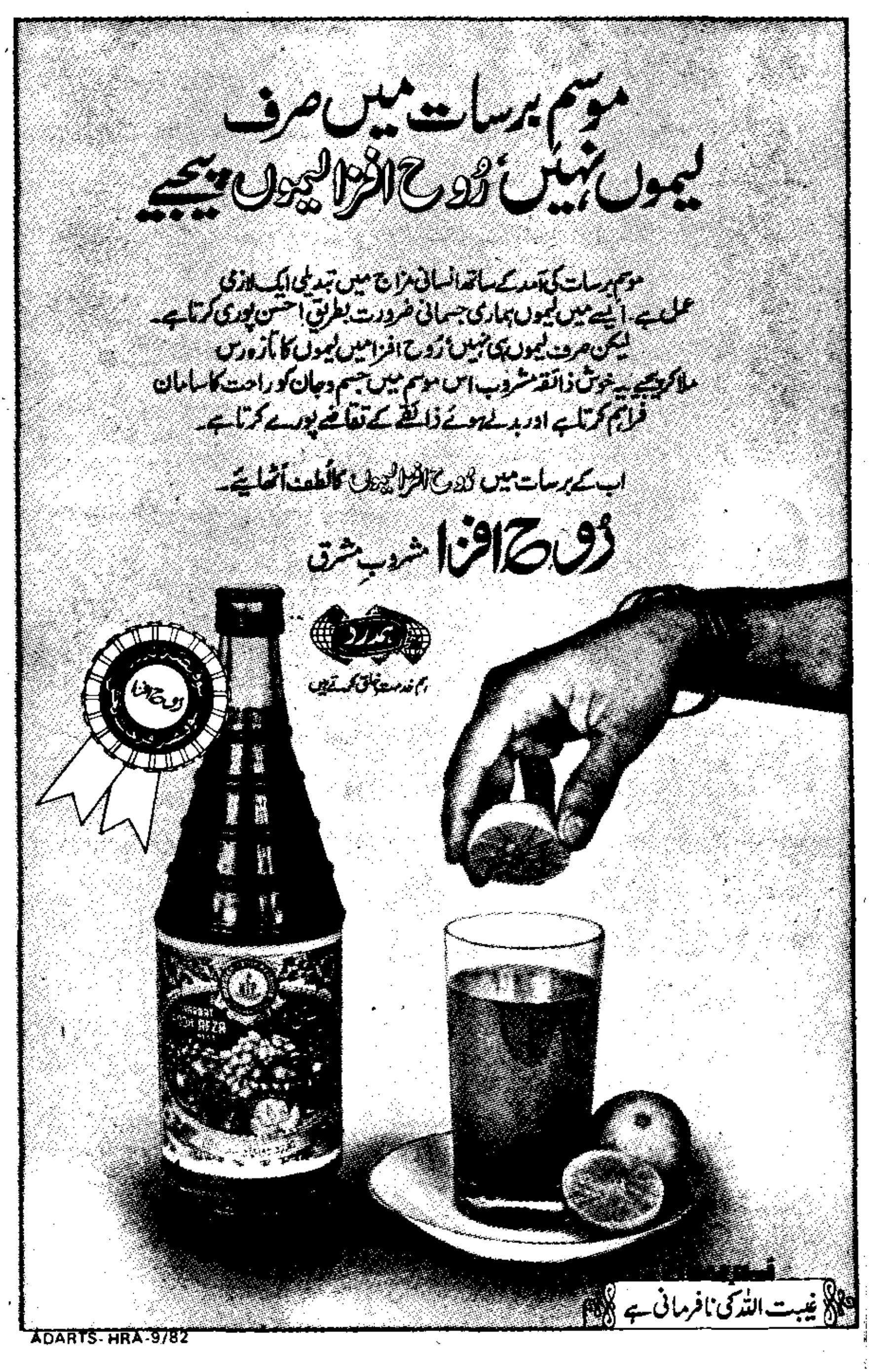


ADARTS-HRA-9/82

# اسلامی انقلاب (قسط ۳)

## مراحل۔ مدارج۔ اور لوازم

### ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک خطاب

ترتیب و تسوید : جمیل الرحمٰن

الحمد للّٰہ۔ الحمد للّٰہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیأت اعمالنا۔ من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ و نشھد ان سیدنا و مولٰنا محمدًا عبدہ و رسولہ، ارسلہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولوکرہ المشرکون ۔ فصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقہٖ محمد و علٰی اٰلہٖ واصحابہ وسلم تسلیمًا کثیرًا کثیرا ۔ امابعد فقد قال اللّٰہ تعالٰی فی سورۃ النساء

اعوذ باللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ قِیْلَ لَھُمْ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ج فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیْھِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ یَخْشَوْنَ النَّاسَ کَخَشْیَۃِ اللّٰہِ اَوْ اَشَدَّ خَشْیَۃً ط وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ کَتَبْتَ عَلَیْنَا الْقِتَالَ ج لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ ط قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ ج وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰی قف وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ہ

وَقَالَ اللّٰہ تعالٰی فی سورۃ الحج

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ۔

وَقَالَ اللّٰہ سبحانہٗ وتعالٰی فی سورۃ البقرۃ .

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۔

وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی فِی هٰذِهِ السُّوْرَةِ

كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ج وَعَسٰۤی اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ج وَعَسٰۤی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ط وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

وَقَالَ اللّٰهُ سبحانه وتعالیٰ فی سورة الانفال

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ

صدق اللّٰه العظیم

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْۤ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ۔

اَللّٰهُمَّ ربنا الهمنا رشدنا واعذنا من شرور انفسنا : اللهم ارنا الحق حقًّا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلًا وارزقنا اجتنابه۔ اللّٰهم وفقنا ان نقول بالحق اینما کنّا لا نخاف فی اللّٰه لومة لائم

آمین یا رب العٰلمین

حضرات! دو جمعوں سے ہمارے یہاں جو مضمون چل رہا ہے۔ وہ ہے انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے مراحل، مدارج اور لوازم کا تفصیلی جائزہ۔ ان میں سے تین ابتدائی اور تمہیدی مراحل کے بارے میں گفتگو مکمل ہو چکی ہے۔ یعنی دعوت و تبلیغ نمبر ایک۔ تنظیم نمبر ۲۔ اور تربیت و تزکیہ نمبر تین ــــ ان تینوں کو جمع کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

اس کا حاصل اور اس کا نتیجہ ہے ایک انقلابی جماعت کا وجود میں آجانا۔

وہ انقلابی جماعت جو ایسے لوگوں پر مشتمل ہو گی جن کا ذہنی و قلبی رشتہ اور تعلق اپنے اس انقلابی نظریہ سے مضبوط طور پر قائم ہو جائے ــــ پھر ان کا یہ ارادہ و عزم کہ ع یا تن رسد بہ جاناں یا جاں ز تن برآید ــــ یعنی اب یا تو ہم اپنے اس نظریہ کو غالب کر کے رہیں گے اور یا اپنی جان دے دیں گے۔ جیسے مجھے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا وہ جملہ یاد آ گیا کہ جب ابو طالب کے پاس آخری سفارت آئی ہے۔ جس میں گویا کہ قریش کی طرف سے ابو طالب کو الٹی میٹم دے دیا گیا کہ اب تک ہم نے تمہارا بہت

لحاظ کیا ہے۔ لیکن چونکہ تم اپنے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ نہیں چھوڑ رہے ہو اور ہم نے تمہارے لحاظ میں اب تک ان کے خلاف کوئی براہ راست اقدام نہیں کیا ہے۔ لیکن اب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ لہٰذا انہیں یہ آخری Warning (انتباہ) ہے کہ یا تو تم ان کی حمایت اور پشت پناہی سے دست کش ہو جاؤ یا پھر میدان میں آجاؤ اور اب کھلا مقابلہ ہو گا۔ اس پر ابوطالب کی ہمت کمزور پڑ گئی۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا کر ساری بات بتائی اور یہ جملہ بھی کہہ دیا کہ "بھتیجے! مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ جسے میں برداشت نہ کر سکوں"۔ اب یہ وہ مرحلہ ہے کہ جس پر گویا کہ حضورؐ نے یہ محسوس کیا کہ اصل سہارا تو اللہ ہی کا ہے۔ لیکن دنیوی سہارا ایک ہی تھا اور نظر آرہا ہے کہ اب شاید وہ سہارا بھی ساتھ چھوڑ رہا ہے۔ اس لئے کہ وہاں قبائلی نظام تھا اور ابوطالب کی حمایت درحقیقت صرف ان کی حمایت نہیں تھی بلکہ پورے خاندان بنی ہاشم کی حمایت تھی۔ چونکہ قبیلے کے سربراہ تھے ابوطالب۔ لہٰذا اگر وہ حضورؐ کی پشت پناہی سے دست کش ہو جاتے ہیں تو گویا پورے قبیلے کی جو حمایت حاصل تھی، وہ اب ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیوی اعتبار سے کوئی سہارا نہ رہا۔ اس وقت حضورؐ کی آنکھوں میں آنسو آئے لیکن زبانِ مبارک سے جو الفاظ نکلے وہ یہ تھے:

> "چچا جان! اب یا تو یہ کام پورا ہو کر رہے گا یا میں اپنے آپ کو اسی میں ہلاک کر دوں گا۔"

یہ ہے اصل میں ایک انقلابی عزم۔ پہلی بات تو یہ کہ جو انقلابی نظریہ ہے اور وہ جس نظام کو برپا کرنا چاہتا ہے، اس نظریہ اور نظام کے ساتھ پورا پورا مضبوط ذہنی و قلبی تعلق ہو اور دوسری بات یہ کہ یہ عزم اور یہ Determination پیدا ہو جائے کہ یا تو یہ نظام غالب ہو گا، قائم ہو گا، نافذ ہو گا۔ انقلاب آئے گا اور یہ مشرکانہ، ظالمانہ، استحصالی نظام ختم ہو کر رہے گا یا ہم اسی کوشش میں اپنے آپ کو ختم کر لیں گے۔ ان دونوں کے مابین کوئی اور درمیانی راستہ نہ رہے۔ تیسری بات یہ کہ یہ انقلابی اتنے منظم ہوں کہ وہ ایک کمان پر حرکت کریں۔ آگے بڑھنے کا حکم ملے تو آگے بڑھیں اور جہاں رک جانے کا حکم دیا جائے وہیں رک جائیں۔ جب تک یہ نظم نہ ہو، اس وقت تک وہ جماعت ایک انقلابی جماعت نہیں ہے۔ پھر تربیت کا مرحلہ ہے اور ظاہر بات ہے کہ مختلف انقلابی جماعتوں کے اپنے اپنے پیش نظر انقلاب کے اعتبار سے یہ تربیت مختلف ہو گی۔ اگر مادی انقلاب برپا کرنا ہے جیسے کہ اشتراکی انقلاب ہے تو صرف مادی تربیت کافی ہے۔ کسی اخلاقی اور

روحانی تربیت میں لوگوں کا وقت ضائع کرنا خواہ مخواہ کی حماقت ہے۔ اگر اسلامی انقلاب پیشِ نظر ہوگا تو اس میں ظاہر بات ہے کہ اخلاق اور روحانیت سرِفہرست ہے۔ جب تک یہ اقدار ان انقلابی کارکنوں میں بتمام و بکمال نہ ہوں کہ جو اسلامی انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں تو پھر انقلاب کے نتیجہ میں وہ اقدار کہاں سے پیدا ہو جائیں گی۔ لہٰذا ایک اسلامی انقلابی جماعت میں تربیت کا یہ پہلو اہم ترین اہمیت کا حامل ہے۔ ان سب کا نتیجہ جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ نکلتا ہے کہ:

"ایک انقلابی جماعت کی تشکیل اور فی الواقع اس کا وجود عمل میں آجانا۔"

میں نے یہ جو تین مراحل بیان کئے ہیں، بہت کچھ بیان کرنے کے بعد بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ تشنگی رہی ہے۔ میں چونکہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ اور اس کا اعلان میں نے پچھلے جمعہ کو بھی دیا تھا کہ میں آج سے اگلے تین مراحل کا ذکر کروں گا۔ لہٰذا میں پچھلے ابتدائی و تمہیدی مراحل پر مزید گفتگو نہیں کرتا۔ بعد میں ان شاء اللہ ان کا ذکر آئے گا اور ان پر مزید تفصیلی گفتگوئیں ہوں گی۔ اس لئے کہ ہمارے دین کا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت کا یہ انقلابی پہلو ہماری نگاہوں سے اوجھل رہا ہے۔ ہم نے نوعِ انسانی کے عظیم ترین انقلابی جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ اقدس پر ایک تقدّس، احترام، تعظیم کا ہالہ اور ایک مافوق الفطرت (Super Human) شخصیت کا ہیولیٰ اور نقشہ اپنے ذہن میں رکھا ہوا ہے جس کی وجہ سے عقیدت و عظمت کا احساس تو پوری طرح موجود ہے لیکن یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے کس طور سے یہ انقلاب برپا فرما دیا ہے۔ سطحِ زمین پر حضورؐ کی جد و جہد کن مراحل سے گزری ہے اور حضورؐ نے قدم بقدم خالص انسانی سطح کی کشمکش سے گزر کر اور ہر مرحلہ پر مصائب و شدائد، تکالیف اور مشکلات جھیل کر کس طریقے پر اسلامی انقلاب کو تکمیل تک پہنچایا ہے، ان اہم امور کا ہم نے محبّت و عقیدت سے ہٹ کر جائزہ نہیں لیا۔ اس لئے کہ اس پہلو سے حضورؐ کا اتباع پیشِ نظر ہی نہیں رہا۔ یہ تو اس وقت ہوگا جب کہ دل میں یہ عزم پیدا ہو جائے کہ اسلامی انقلاب برپا کرنا ہے۔ تب انسان سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کا خاص طور پر اس پہلو سے مطالعہ کرے گا کہ کیا Land Marks ہیں، وہ کیا اہم نشاناتِ راہ ہیں کہ جو ہمیں سیرتِ مبارکہ سے اسلامی انقلابی عمل کے لئے ملتے ہیں۔

بہرحال میں نے آج سوچا تھا کہ ان تین ابتدائی و تمہیدی مراحل کے بارے میں صرف ایک ایک بات دوبارہ یاد کرا دوں۔ چونکہ الفاظ کے مشترک ہونے کی وجہ سے انسان دھوکہ کھا جاتا ہے ـــــ تبلیغ کا لفظ مشترک ہے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ ایک ہوتی ہے خالص مذہبی

تبلیغ۔ اور ایک ہوتی ہے انقلابی تبلیغ اور ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے لیکن الفاظ مشترک ہیں، آدمی مغالطہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ خالص مذہبی تبلیغ کی سب سے نمایاں مثال عیسائیت کی تبلیغ ہے۔ صرف عقیدہ ہی عقیدہ ہے، شریعت ہے ہی نہیں۔ لہٰذا نظام کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پس عیسائیت کی تبلیغ کا کیا مطلب ہے! صرف ایک عقیدہ کی تبلیغ۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ اور انقلابی تبلیغ کی مثال ہے اشتراکی تبلیغ۔ ظاہر بات ہے کہ اشتراکی بھی اپنے نظریہ اور فکر کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اپنا لٹریچر پھیلاتے ہیں۔ اپنے خیالات عام کرتے ہیں۔ اپنا فلسفہ ذہنوں میں اتارتے ہیں۔ امیر و غریب کے فرق کو Exploit کرتے ہیں۔ مزدور، کسان اور معاشرے کے دبے ہوئے طبقات کے دلوں میں سرمایہ دار، صنعت کار، زمیندار کے استحصالی ہتھکنڈوں سے نفرت و عداوت پیدا کرتے ہیں۔ طبقاتی تفاوت کا شعور بیدار کرتے ہیں۔ یہ ان کی تبلیغ ہے لیکن یہ انقلابی تبلیغ ہے، ان کے پیشِ نظر محض تبلیغ نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو ذریعہ ہے یہ تو درمیانی منزل ہے۔ اصل میں پیشِ نظر اشتراکی انقلاب برپا کرنا ہے۔ جو لوگ اس نظریہ کو قبول کریں، انہیں منظّم کرنا ہے۔ ایک کمیونسٹ پارٹی وجود میں لانی ہے۔ اس کے Cell Organise کرنے ہیں۔ پھر ان کے انقلاب کا جو بھی مخصوص طریق کار ہے اس پر عمل پیرا ہو کر انقلاب برپا کرنا ہے۔ پس ایک مذہبی تبلیغ ہے۔ ایک انقلابی تبلیغ ہے ـــــ اگر ہم اس پہلو سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ دیکھیں اور سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کا معروضی (Objectively) مطالعہ کریں تو کم از کم اس میں ہمیں جو بات نظر آئے گی اس کی محتاط ترین تعبیر یہ ہوگی کہ اس میں ہمیں یہ دونوں تبلیغیں جمع ملتی ہیں۔ عقیدہ کی تبلیغ بھی ہے، یعنی توحید، آخرت اور رسالت کی تبلیغ بھی ہو رہی ہے ـــــ لیکن اس تبلیغ کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ، تکبیرِ رب، اظہار دینِ الحق واضح طور پر نظر آتا ہے: لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا۔ اس تبلیغ کا یہ ہدف و مقصد ہے۔ یہ گویا کہ اس کا انقلابی رنگ ہے۔

اسی طرح تنظیم اور جماعت ہے۔ ایک سیاسی جماعت کو بھی جماعت کہہ دیتے ہیں اور جماعت ایک انقلابی جماعت بھی ہوتی۔ تنظیمی ہئیت کے اعتبار سے کسی ادارے کو، کسی انجمن کو، کسی ایسوسی ایشن کو بھی تنظیم کہہ سکتے ہیں چونکہ اس میں بھی لوگ کسی مقصد کے لئے جمع ہوئے ہیں، کوئی دستور ہے، چند قواعد و ضوابط ہیں۔ انتخابات کا طریق کار معیّن ہے۔ عہدیدار ہیں، فنڈ ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ لینی چاہئیے کہ انقلابی جماعت یا تنظیم لعبیہ تمام جماعتوں اور

تنظیموں سے ممتاز ہوتی ہے اپنے ڈسپلن، اپنے نظم کے اعتبار سے۔ ایسی جماعت میں جب تک فوج کا سا ڈسپلن نہ ہو، وہ انقلابی جماعت نہیں ہے۔ کوئی ڈھیلی ڈھالی ایسوسی ایشن کوئی چار آنے والی ممبری والی جماعت وہ انقلابی جماعت نہیں ہوتی ـــــ انقلابی جماعت کے لئے تو قرآن و حدیث کی اصطلاح ہے۔ سمع و طاعت ـــــ وہاں تو معاملہ ہوتا ہے فَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا (یعنی سنو اور اطاعت کرو)۔ اس کے بغیر انقلابی جماعت کے نظم کا تصوّر ممکن ہی نہیں ہے۔

اسی طرح میں نے پچھلے جمعہ میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا جو طریق تربیت اور تزکیہ ہے، اس پر بھی گفتگو کی تھی۔ اس کو ان اصطلاحات کے حوالے سے ذہن میں رکھئے کہ ایک ہے خانقاہی نظامِ تربیت و تزکیہ۔ اور ایک ہے انقلابی نظامِ تربیت و تزکیہ۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ خانقاہی نظام وہاں وجود میں آتا ہے، جہاں یا تو انقلاب پیشِ نظر نہ ہو یا انقلاب آچکا ہو جس کے بعد لوگوں کی روحانی تربیت اور ہوائے نفس کا تزکیہ کرنا ہے۔ اب انقلابی تربیت کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ عیسائیوں کے یہاں جو خانقاہی اور راہبانہ نظام بنا وہی کل کا کل ان کا نظام بن کر رہ گیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ انقلاب سرے سے ان کے پیشِ نظر تھا ہی نہیں۔ جب پال (پولوس) نے شریعت ہی ساقط کر دی تو انقلاب کا سوال ہی کہاں رہا۔ لہٰذا ان کے یہاں تو لامحالہ تربیت کا نظام صرف اور صرف خانقاہی اور راہبانہ بننا چاہیے تھا۔ ہمارے یہاں یہ خانقاہی نظام کب آیا! جب کہ اسلامی حکومت قائم ہو چکی۔ شریعت نافذ ہے۔ عدالتیں ہیں، فقہاء ہیں، مفتی ہیں، قاضی ہیں۔ شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کے مطابق فیصلے ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اب انقلاب کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تو یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ سے لَو لگانے اور اللہ کے زیادہ سے زیادہ ذکر کرنے کے طریقے سکھائے جائیں۔ باطنی امراض دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ خانقاہی نظام اس وقت وجود میں آیا جب ایک وسیع و عریض خطّہ پر انقلاب کے نتیجہ میں اسلامی نظام قائم ہو چکا تھا۔ اس وقت تو ٹھیک تھا۔ لیکن یہ بات ذہن میں رکھئے کہ اگر حالات وہی ہیں تب تو بات اور ہے لیکن اگر اسلام بحیثیت حکمران دین قائم و نافذ نہیں ہے اور پیشِ نظر اسلامی انقلاب لانا ہے۔ تو پھر انقلابی تربیت کا نظام لانا پڑے گا ـــــ اور یہی انقلابی تربیت ہے جو ہمیں جنابِ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نظام میں ملتی ہے۔ اس موضوع پر میرا ارادہ ہے کہ ان شاء اللہ

میں ایک تقریر مزید کروں گا۔ اس لئے کہ اصطلاحات مشترک ہیں۔ تہجد ہے، نماز ہے، زکوٰۃ ہے، روزہ ہے، انفاق ہے۔ یہ سب وہاں بھی ہیں، یہاں بھی ہیں۔ لیکن وہاں ان کا کچھ اور ہدف ہے، وہاں ان کا کچھ اور نظام بنتا ہے۔ اور یہاں ان کا کچھ اور نظام بنتا ہے۔ وہ فرق واتمیاز اگر سامنے نہ رہے تو بسا اوقات اچھے بھلے انقلابی لوگوں کے سامنے بھی جب تربیت و تزکیہ کی بات آتی ہے تو خانقاہی تربیت و تزکیہ کی طرف ان کا ذہن مائل ہو جاتا ہے۔ وہ اس لئے کہ صرف الفاظ کے اشتراک سے نتیجہ وہ نکل آتا ہے کہ لوگ اسی خانقاہی نظام تربیت و تزکیہ ہی کو اصل مقصود سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اس نظام کے رواج کی دو چار برس کی بات نہیں ہے۔ یہ نظام ہمارے یہاں کم ازکم بارہ سو سال کی تاریخ رکھتا ہے۔ وہ اتنا پختہ ہو چکا ہے اور پھر یہ کہ الفاظ بالکل مشترک ہیں۔ لہٰذا اس قدامت اور اشتراکِ الفاظ کی وجہ سے لامحالہ ذہن اس طرف چلا جاتا ہے کہ یہ خانقاہی نظام تربیت ہی اصل مقصود و مطلوب ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو انقلابی نظام تربیت و تزکیہ ہے اس کی طرف سے توجہات ہٹ جاتی ہیں۔ لہٰذا میں ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ اس موضوع پر میں ایک علیحدہ مفصل تقریر کروں گا۔ اور وہ میں انشاء اللہ کسی اور موقع پر کروں گا۔

آج میں سابقہ اعلان کے مطابق آگے بڑھ رہا ہوں اور وہ ہے اس انقلاب میں تصادم کے مراحل جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برپا فرمایا۔ اس ضمن میں سب سے پہلی بات تو میں یہ عرض کروں گا کہ لفظ تصادم سے ہمیں گھبرانا نہیں چاہئیے۔ دوسری بات یہ کہ ہمارا جو انداز معذرت خواہانہ اور Apologatic رہا ہے کہ اسلام میں تو صرف مدافعانہ جنگ ہے، تصادم اور جارحیت نہیں ہے اس کو پہلے ہی اپنے ذہن سے کھرچ دیں۔ ہم پر چونکہ اغیار نے بڑا شدید اعتراض کیا کہ یہ مسلمان قوم بڑی خونی قوم ہے۔ انہوں نے ایسی داستانیں گھڑلیں کہ اسلام کی جو بھی تبلیغ ہوئی ہے، وہ تلوار سے ہوئی ہے۔ ؏

بُو ئے خون آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے[1] اغیار نے ہم پر یہ تہمت اس شد و مد سے لگائی[2] کہ ہم ہاتھ جوڑتے ہی رہ گئے اور ہم معذرت کے انداز سے اس الزام کو اپنے سر سے اتارنے میں حد

[1] اگر اسلام تلوار سے پھیلایا جاتا تو ہسپانیہ اور ہندوستان میں جہاں مسلمانوں نے قریباً ایک ہزار سال حکومت کی کیا غیر مسلم اکثریت میں رہ جاتے؟ اور کیا مشرقِ وسطیٰ میں کوئی غیر مسلم نظر آتا؟

[2] اس کا اصل سبب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ الزامات لگانے والوں کے اپنے مظالم کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول نہ ہو جائے۔ (مرتب)

سے تجاوز کر گئے۔ یہ انداز اب بالکل بدل جانا چاہیئے اور الحمد للہ ہمارے بہت سے اصحاب علم و فضل کی مدلل تحریروں کی بدولت بڑی حد تک یہ انداز بدل بھی گیا ہے۔ لیکن نام نہاد دانش وروں کی ابھی اچھی خاصی تعداد خود ہمارے یہاں ایسی موجود ہے جن کے ذہنوں پر سابقہ دور کی فضا کی چھاپ ابھی موجود ہے۔ اور وہ اسی فضا میں سانس لے رہے ہیں اور یہی راگ الاپتے رہتے ہیں کہ اسلام میں صرف مدافعانہ جنگ ہے۔ اسلام میں کوئی جارحانہ جنگ نہیں ہے۔ حضورؐ نے صرف مدافعت کے لئے جنگ لڑی ہے۔ حضورؐ نے کبھی بھی پیش قدمی کر کے جنگ کا آغاز نہیں کیا۔ وغیرہ وغیرہ ــــ یہ باتیں جس انداز سے ذہن میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ اصل میں وہ انداز بالکل غلط ہے ــــ اس کو بالکل ختم ہونا چاہیئے۔

میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر ایک اصول سمجھ لیجئے کہ کوئی انقلابی تنظیم یا انقلابی جماعت جب کسی معاشرے میں اپنی دعوت کا آغاز کرتی ہے تو محض یہ دعوت کا آغاز ہی اس کی طرف سے تصادم کا آغاز ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ انقلاب اسی کا نام ہے کہ کوئی کھڑا ہو کر کہے کہ یہ نظام جو چل رہا ہے یہ سراسر غلط نظام ہے۔ جب آپ رائج الوقت نظام کو غلط کہہ رہے ہیں اور اس عزم کا اظہار کر رہے ہیں کہ اس کو بدلنا ہوگا تو تصادم کا آغاز آپ نے کر دیا۔ اس لئے کہ جو مراعات یافتہ طبقات ہیں، جن کے Vested Interest اس باطل نظام سے وابستہ ہیں، ان کی عافیت تو اسی میں ہے کہ رائج الوقت نظام قائم رہے۔ Status quo برقرار رہے۔ دبے ہوئے طبقات جن بندھنوں میں بندھے ہوئے ہیں، انہی میں بندھے رہیں جس طرح کی جکڑ بندیوں میں ہیں اسی طرح کی جکڑ بندیوں میں رہیں۔ جو ظالم اور استحصالی طبقات ہیں وہ ہرگز نہیں چاہیں گے کہ وہ جن ناجائز حقوق کے مالک ہیں، وہ ان سے چھن جائیں۔ وہ تو یہی چاہتے ہیں کہ نظام جیسا بھی ہے ویسا ہی رہے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ نظام غلط ہے اس کو ہم تبدیل کر کے رہیں گے یا اس جدوجہد میں ختم ہو جائیں گے۔ پس تصادم کا آغاز تو آپ نے کیا۔ جو بھی ہو، چاہے وہ فرد واحد ہو۔ یا کوئی گروہ ہو، یا کوئی جماعت ہو اس لئے کہ اس کا بالکل منطقی مطلب یہی ہے کہ آپ اس نظام کو غلط کہہ رہے ہیں۔ اس کی تردید کر رہے ہیں۔ اسے ظالمانہ اور استحصالی کہہ رہے ہیں۔ اس کو ختم کرنے کا داعیہ لے کر سامنے آئے ہیں تو گویا آپ نے رائج الوقت نظام کو چیلنج کیا ہے۔ البتہ اس کے بعد وہ نظام اور وہ معاشرہ اس دعوت کے خلاف Retaliate کرتا ہے۔ اس کے خلاف اقدام اور کارروائی کرتا ہے۔ باطل نظام کی جانب سے جو ردِ عمل (Retaliation)

ہوتا ہے اس کے مراحل میں بعد میں بیان کروں گا۔

لیکن جو بات اس وقت آپ کے ذہن نشین کرانی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ تصادم کا آغاز ہمیشہ انقلابی دعوت دینے والوں کی طرف سے ہوتا ہے۔ چاہے وہ کوئی فرد ہو، گروہ ہو، جماعت ہو۔ اگرچہ وہ جماعت ہاتھ نہیں اٹھاتی وہ کسی کو گالیاں نہیں دیتی، کسی کو کسی نوع کی جسمانی تکلیف نہیں پہنچاتی لیکن وہ یہ دعوت لے کر اٹھتی ہے کہ پورا نظام غلط اور فاسد ہے اور اس داعیہ کا اظہار کرتی ہے کہ یا تو اس نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر اپنے نظریہ پر بالکل نیا نظام قائم و نافذ ہو کر رہے گا یا اسی کوشش اور جد وجہد میں ہم اپنی جانیں دیدیں گے ـــــ اب آپ اندازہ کیجئے کہ جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آغاز کہاں سے فرمایا! تمہارا مذہب غلط، تمہارا معاشرہ غلط، تمہارے اخلاق غلط، تمہارا پورا نظام غلط۔ یہ صدیوں سے قائم و رائج نظام سے بغاوت ہے۔ یہ ان لوگوں کے خلاف چیلنج ہے جو اس نظام میں قیادت و سیادت کے مناصب پر فائز ہیں اور جو اس نظام سے ناجائز اور استحصالی طور طریقوں سے انتفاع کر رہے ہیں۔ یہ ہے وہ بات جس کے متعلق میں کہہ رہا ہوں کہ تصادم کا آغاز داعیٔ انقلاب کرتا ہے اور وہ جماعت کرتی ہے جو اس دعوت کو قبول کر کے داعیٔ انقلاب کے اعوان و انصار پر مشتمل ہوتی ہے۔

میں نے علامہ اقبال کا یہ شعر آپ کو بار بار سنایا ہے وہ تصادم کے لئے اور اس سے پہلے کے مراحل کو جامعیت کے ساتھ ادا کرنے میں میری رائے ہے کہ شاہکار (Master Piece) ہے۔ دعوت و تبلیغ، تربیت و تزکیہ، تنظیم و جماعت ان سب مراحل کو ایک مصرع میں سمو دیا گیا کہ ؎ با نشّہ درویشی درساز و دمادم زن

اب جب تیار ہو گئے، ایک جماعت وجود میں آ گئی۔ ایک قوّت فراہم ہو گئی۔ فدائین کا ایک گروہ ہے جو تمہارے حکم پر اٹھنے اور گردن کٹانے کے لئے تیار ہے۔ بلکہ اس کو اپنے لئے سب سے بڑی سعادت سمجھتا ہے تو اس کو علامہ نے کہا ہے ؎

چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

اب پکّے ہو گئے۔ خشت بن گئے تو اب اپنے آپ کو سلطنتِ جم پر دے مارو ـــ یہاں سلطنتِ جم سے مراد بطورِ استعارہ وہاں کا قائم و رائج نظام مراد لیجئے۔ انقلاب اسی طرح آئے گا۔ اگر وہ طاقت محفوظ پڑی رہے، وہ Potential جو فراہم ہوا ہے وہ active نہ ہو۔ رہے، غیر متحرک اور غیر فعّال رہے تو ظاہر بات ہے کہ انقلاب نہیں

آسکے گا ۔ لہٰذا اس شعر کے حوالے سے بھی یہ بات ذہن میں رکھئے کہ تصادم کا آغاز درحقیقت انقلابی جماعت کی طرف سے ہوتا ہے اور تصادم انقلاب کا ناگزیر خاصّہ ہوتا ہے ۔

پھر تصادم کا آغاز تو اسی لمحہ ہو جاتا ہے جس لمحہ انقلابی دعوت شروع ہوتی ہے۔ لیکن ابھی اس انقلابی جماعت کو ضرورت ہوتی ہے کہ کچھ مہلت اسے ایسی ملے، جس میں وہ اپنی دعوت کی توسیع کر سکے۔ اپنے دعوتی Base کو Broad کر سکے۔ لوگ اس کی طرف متوجّہ ہوں۔ اسے قبول کریں۔ اس جماعت میں شامل ہوں ۔ پھر ان کی تربیت ہو۔ ان کو منظّم کیا جائے۔ اس کام کے لئے بڑا وقت اور مہلت درکار ہے ۔ جس کو انگریزی میں کہتے ہیں —— 'To Buy Time' آپ نے اپنے دشمنوں سے وقت کو خریدنا ہے۔ ان سے کچھ مہلت آپ نے لینی ہے۔ لہٰذا پہلا مرحلہ (Phase) ہوتا ہے صبرِ محض کا ۔ جسے میں Passive Resistance سے تعبیر کیا کرتا ہوں ۔ معاندین و مخالفین داعی کے متعلق کہیں گے کہ یہ پاگل ہے، دیوانہ ہے، مجنون ہے، بیوقوف ہے ۔ Fanatic ہے۔ ان کی عقل اور مت ماری گئی ہے ۔ حکمتِ دعوت کا تقاضا ہے کہ ان سب کو برداشت کرو۔ تمہاری زبان سے کوئی نازیبا جملہ نہ نکلے۔ ان مخالفین کے تمام استہزاء و تمسخر کو خندہ پیشانی سے جھیلو۔ مصابرت و استقامت کا مظاہرہ کرو ۔ اپنے موقف پر ڈٹے رہو۔ دعوت و تبلیغ کا کماحقّہٗ فرض انجام دیتے رہو ۔ جب مخالفین اس میں ناکام ہو جائیں گے اور دیکھیں گے کہ ہم نے جس کو مشتِ غبار سمجھا تھا اور اسے چٹکیوں میں اڑانا چاہا تھا، وہ تو زبردست آندھی بنتی نظر آرہی ہے۔ عام لوگوں خاص طور پر ہمارے نوجوانوں کو متاثر کر رہی ہے اور وہ داعی کے اعوان و انصار بن رہے ہیں تو پھر مخالفین آگے بڑھ کر ماریں گے —— اس طرح دوسرا مرحلہ (Phase) تشدّد کا شروع ہوتا ہے ۔ معاندین دعوت قبول کرنے والوں پر ستم اور مصائب کے پہاڑ توڑتے ہیں۔ دہکتی آگ پر ننگی پیٹھ لٹاتے ہیں۔ مکّہ کی سنگلاخ اور توے کی طرح تپتی ہوئی زمین پر کھینچتے ہیں ۔ برچھی سے ایک مظلوم خاتون کو نہایت بہیمانہ طور پر ہلاک کرتے ہیں ۔ کسی کے ہاتھ پاؤں سرکش اونٹوں سے باندھ کر اونٹوں کو بھگاتے ہیں کہ جسم کے چیتھڑے اڑ جاتے ہیں۔ کسی کو چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھواں چھوڑتے ہیں کسی کو مادر زاد ننگا گھر سے نکال دیتے ہیں۔ کسی کو اتنا پیٹتے ہیں کہ بس مرنے کی کسر رہ جاتی ہے —— داعی الی اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر دست درازی کرتے ہیں۔ آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھاتے

ہیں۔ آپؐ کے گھر میں غلاظت پھینکنے کا معمول بناتے ہیں۔ آپؐ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر گلا گھونٹنے کی کوشش کرتے ہیں کہ چشم ہائے مبارک اُبل پڑتی ہیں۔ آپؐ کی پشتِ مبارک پر عین سجدہ کی حالت میں اونٹ کی نجاست بھری اوجھڑی رکھ دیتے ہیں۔ آپؐ پر پتھروں کی اس قدر بارش ہوتی ہے کہ جسمِ اطہر لہولہان ہو جاتا ہے۔ آپ کا معاشی مقاطعہ ہوتا ہے اور آپؐ کو تین سال تک آپؐ کے قبیلے کے تمام لوگوں کے ساتھ، چاہے انہوں نے دعوت قبول کی ہو یا نہ کی ہو ایک وادی میں محصور کر دیا جاتا ہے ـــــ لیکن حکم ہے کہ معاندین و مخالفین کے ان تمام متشدّدانہ طرزِ عمل کو برداشت کرو۔ جواب میں اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ مت اٹھاؤ ـــــ البتہ اپنے موقف پر ڈٹے رہو۔ اس سے پیچھے نہ ہٹو۔ کوئی بھی معافی اور توبہ نامہ دے کر ان مصائب سے بچنے کا خیال بھی دل میں نہ لاؤ۔ لیکن ہاتھ اٹھانے کی قطعی اجازت نہیں ہے۔ جواب میں تشدّد کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ ہے صبرِ محض۔ اسی کو کہا جاتا ہے:

'Passive Resistance'

صبرِ محض کا یہ مرحلہ ہے جو جنابِ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ مطہرہ میں مسلسل بارہ برس تک جاری رہا۔ اور اس بارہ سال کے عرصہ میں اس بہیمانہ تشدّد کی وجہ سے نہ تو کسی نے کمزوری دکھائی نہ اپنے موقف سے ہٹا اور نہ ہی کسی نے جواباً ہاتھ اٹھایا۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اگر آدمی مشتعل (Desperate) ہو جائے اور وہ سمجھ لے کہ مجھے تو مرنا ہی مرنا ہے تو کم از کم دو چار کو ساتھ لے کر تو مروں ـــ لیکن یہ کمال ہی نہیں معجزہ ہے جنابِ محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تربیت و تزکیہ کا کہ ایک شخص نے بھی حکم اور ہدایت کی خلاف ورزی نہیں کی۔ نہ کوئی اپنے موقف سے ہٹا اور نہ کسی نے جواب میں ہاتھ اٹھایا۔ یہ اہم ترین وقت ہے۔ اسی کے متعلق میں نے کہا ہے کہ یہ ہو وہ مہلت تھی جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھرپور طریقے پر استعمال فرمایا ہے۔ اب اس بات کو ذہن میں رکھیے کہ سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی سے تو ہمیں پورا فلسفۂ انقلاب سیکھنا ہے۔ وہیں سے ہمیں اصول اخذ کرنے ہیں۔ اب اس بات پر غور کیجئے کہ اس صبرِ محض (Passive Resistance) کے مرحلہ کی حکمت کیا ہے؟ وہ یہ کہ ابتداء میں چند باہمت اور سلیم الفطرت لوگ اس انقلابی نظریہ کے قائل و حامی ہوتے ہیں۔ اگر وہ لوگ Voilent ہو جائیں یعنی تشدّد کا جواب تشدّد سے دینے لگیں تو اس غلط نظام کے علمبرداروں کو پورا اخلاقی جواز مل جائے گا کہ انقلاب کے حامیوں کو کچل کر رکھ دیں۔ جب تک انہوں نے ہاتھ نہیں اٹھایا تو ان مخالفین و معاندین کے چودھریوں اور سرداروں کے پاس کوئی اخلاقی جواز نہیں ہے۔ چنانچہ اس حال میں اگر

وہ تشدد کر رہے ہیں تو بلا جواز کر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رفتہ رفتہ عامۃ الناس کی ہمدردیاں اس انقلابی جماعت کے ساتھ ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان لوگوں کو آخر کیوں مارا اور ستایا جا رہا ہے! جبکہ یہ ہمارے معاشرے کے شریف، بے ضرر اور بہتر افراد میں سے ہیں۔ اور یہ لوگ خاموشی سے کیوں ماریں کھا رہے ہیں! اب ذرا چشم تصور سے دیکھئے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مکہ کی سنگلاخ اور تپتی زمین پر گردن میں رسی باندھ کر اس طرح گھسیٹا جا رہا ہے جیسے کسی مردہ جانور کی لاش کو گھسیٹا جاتا ہے۔ آخر دیکھنے والے بھی انسان تھے۔ ان کے اندر بھی احساسات تھے! اگرچہ ان میں جرأت نہیں ہے، ہمت نہیں ہے کہ اس بہیمانہ ظلم پر صدائے احتجاج بلند کریں۔ ایسے لوگوں کو اصطلاح میں 'Silent Majority' کہا جاتا ہے یعنی خاموش اکثریت۔ یہ نہ سمجھئے کہ وہ خاموش اکثریت اندھی اور بہری ہوتی ہے۔ دیکھتی اور سنتی بھی نہیں ہے۔ خاموش تو ہے بولتی نہیں ہے لیکن وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتی رہتی ہے کہ یہ کیسا ظلم ہو رہا ہے! وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ جیسے محنتی اور فرض شناس غلام کے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک کیوں ہو رہا ہے!

یہ خبابؓ ابن ارت کے ساتھ کیا ہو رہا ہے! یہ تو بہت ہی بھلا انسان ہے۔ بڑا شریف النفس ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ حضرت خباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ پیشہ کے اعتبار سے لوہار تھے۔ اور بڑے ہی نیک نوجوان تھے۔ ظاہر بات ہے کہ جو حضورؐ کے دامن سے وابستہ ہوا ہو اس کی طبیعت میں پہلے ہی سے نیکی اور سعادت ہوگی۔ پھر نُور علیٰ نور کے مصداق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد ان کے کردار میں کیا نکھار آیا ہوگا! آخر ان رضی اللہ عنہ کے گاہک اور ان رضی اللہ عنہ سے کام لینے والے جانتے نہیں تھے کہ یہ کس کردار کا آدمی ہے! وعدے کے مطابق وقت پر کام کر کے دیتا ہے۔ کام بھی اعلیٰ معیار کا ہوتا ہے۔ پوری ذمہ داری اور جان ماری کے ساتھ کام کرتا ہے۔ صرف سر پر سے ایک بوجھ اتارنے اور پیسے کھرے کرنے کے لیے نہیں کرتا۔ یہ سارا تجربہ مکہ والوں کو ہے اور پھر وہ دیکھتے ہیں کہ دھکتے ہوئے انگارے بچھا کر ان پر اس شخص کو لٹایا گیا ہے۔ اب آپ بتائیے کہ کیا مکہ کی پوری فضا کے اُوپر ایک دفعہ جھرجھری نہیں آگئی ہوگی! ٹھیک ہے ہمت نہیں ہے کہ اس ظلم کے خلاف زبان کھولیں چونکہ ان مظالم کرنے والوں میں ابوجہل ہے، ولید بن مغیرہ ہے، امیہ ابن خلف ہے، عقبہ ابن ابی معیط ہے، عتبہ ابن ربیعہ ہے۔ یہ بڑے بڑے چودھری اور سردار ہیں۔ ان کے خلاف بولنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ کوئی ان کے مقابلہ میں کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ تو عوام کا ان کے خلاف کھڑے ہونے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اندر ہی اندر ہمدردی کے احساسات پیدا ہو رہے اور جگہ بنا رہے ہیں۔ وہ کیفیت ہو رہی ہے جسے ایک شاعر نے ایک مصرع میں یوں ادا کیا کہ "جو دلوں کو

فتح کرے وہی فاتحِ زمانہ'، تو دل اندر ہی اندر فتح ہو رہے ہیں کہ نہیں ہو رہے ہیں! وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان مظلوموں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ کوئی غلطی نہیں کی۔ کسی کے ساتھ کوئی گستاخی نہیں کی۔ بس ایک بات وہ یہ کہتے ہیں کہ **اللہ** ایک ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ **محمدؐ** اللہ کے رسُول ہیں صلی اللہ علیہ وسلم۔ بس ان دو باتوں کا یہ اقرار کر رہے ہیں۔ کسی کو انہوں نے کبھی گالی نہیں دی۔ کسی پر انہوں نے آج تک ہاتھ نہیں اٹھایا۔ کسی کو انہوں نے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا۔ پھر ان کے ساتھ یہ ظلم، یہ تشدّد، یہ تعدی، یہ ستم کیوں ہو رہا ہے !۔

یہ ہے اصل میں صبرِ محض کے مرحلے کی حکمت اور اس کا فلسفہ۔ کسی انقلابی جماعت کا یہ جو صبرِ محض (Passive Resistance) کا دور ہوتا ہے اس میں ایک طرف تو اُسے اپنے تین ابتدائی کاموں کو کرنے کی مہلت ملتی ہے اور وہ تین کام ہیں کہ دعوت زیادہ سے زیادہ پھیلانا، دعوت قبول کرنے والوں کو منظم کرنا اور پھر اس مرحلے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی تربیت کرنا۔ اس لیے کہ اگلے مراحل کی کامیابی کا انحصار انہی لوگوں پر ہے۔ گویا اگلے تمام مراحل کی کامیابی کا دارومدار ان تمہیدی و ابتدائی مراحل کی پختگی پر ہے۔ اگر ان مراحل کے تقاضوں کو کما حقہ ادا کیا گیا ہے اور انقلابی کارکنوں کی سیرت و کردار میں پختگی اور مضبوطی آگئی ہے، تب تو آگے چل کر کامیابی ہوگی۔ ورنہ جیسا کہ میں بارہا مثال دے چکا ہوں کہ آپ ریت کا گولہ بنا کر شیشے پر ماریں گے تو شیشہ کھڑا رہے گا اور وہ ریت بکھر جائے گی ——————— خلاصہ

کلام یہ کہ اس صبرِ محض کے دوران ان کاموں کے لیے مہلت ملتی ہے۔ پھر ایک اہم ترین بات یہ کہ ماریں کھا کر لیکن ہاتھ نہ اٹھا کر ایک طرف ان کارکنوں میں قوت برداشت، قوت ارادی پروان چڑھتی اور اپنے موقف سے ان کی وفاداری مضبوط ہوتی ہے اور اس پر استقامت حاصل ہوتی ہے، جیسے خام سونا کٹھالی میں تپ کر کندن اور خالص سونا بنتا ہے، اسی طرح ان انقلابی کارکنوں میں مظالم و مصائب کی بھٹیوں سے گزر کر ایک آہنی عزم اور پہاڑوں سے ٹکرانے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے اور ان میں ایثار و قربانی کا جذبہ اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ جاتا ہے۔ اور دوسری طرف یہ جور و تعدی، یہ تشدد و ستم جھیل کر معاشرہ کی خاموش اکثریت کے دل جیتتے چلے جاتے ہیں۔

اس صبرِ محض (Passive Resistance) کے بھی دو مراحل (Phases) ہیں ان کو بھی آج اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ شاید ہی وضاحت سے اس کا ذکر میں نے کبھی پہلے کیا ہو۔ پہلا مرحلہ وہ ہوتا ہے جس میں زبانی کلامی تشدد ہوتا ہے۔ کوفت پہونچاؤ۔ ذہنی اذیت پہونچاؤ۔ لیکن کوئی جسمانی تشدد اور جسمانی تکلیف نہ دو۔ اس مرحلہ میں اصل ہدف اور نشانہ بنتا ہے خود داعی، دعوت کا آغاز کرنے والا۔ اس کے

ساتھی ہدف نہیں بنتے۔ اس لیے کہ ابتداء میں لوگ محسوس کرتے ہیں کہ یہ شخص ہے جس کا دماغ خراب ہوا ہے اور یہ ہمارے نوجوانوں کے دماغ خراب کر رہا ہے۔ ان نوجوانوں کو تو انہوں نے Re - Claim کرنا ہے۔ انہیں واپس لینا ہے لہٰذا ان کے خلاف ابھی ہاتھ نہیں اٹھائے جائیں گے۔ بلکہ جو داعی ہے اس کی شخصیت کو مجروح کرنے (Character Assasination) کی کوشش ہو گی۔ کہا جائے گا: پاگل ہے۔ دماغ خراب ہو گیا ہے، مجنون ہے، Fanatic ہے۔ ساحر ہے شاعر ہے اور دیوانہ ہے۔ سیرت مطہرہ میں یہ ساری ہی باتیں ملتی ہیں جن کا تذکرہ ابتدائی مکی سورتوں میں آتا ہے تو مکی دور کے قریباً تیرہ برس کے ابتدائی تین سال میں صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر تشدد ہوا ہے اور تشدد جسمانی نہیں بلکہ صرف لسانی، زبانی، کلامی تشدد کہ ان کو کوفت پہنچاؤ۔ انہیں ذہنی اذیت پہنچاؤ۔ جیسے کہ قرآن مجید میں سورۃ الحجر میں ان معاندین و مخالفین کا یہ قول نقل کیا گیا ہے: یَاَیُّھَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْہِ الذِّکْرُ اِنَّکَ لَمَجْنُوْنٌ" اگر ذرا سی عربی زبان سے واقفیت ہو تو اندازہ ہو کہ کتنا زہر میں بجھا ہوا یہ جملہ ہے۔ "اے فلانے جو یہ سمجھتا ہے کہ اس پر کوئی ذکر نازل ہو رہا ہے ہم تو تم کو پاگل سمجھتے ہیں"۔ اب یہ بات سنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ اب بتائیے کہ اس کا کیا کوئی اثر نہیں ہو گا! طبیعت پر کوئی ملال نہیں آئے گا! کوئی رنج نہیں پہنچے گا اس کو کہتے ہیں اعصابی جنگ یعنی (War of Nerves)۔ کسی طرح سے ان کی قوت ارادی کو ختم کر دیں۔ ان کے اندر جو آہنی عزیمت ہے، کسی طرح اس کو پگھلا کر رکھ دو۔ یہی سورۃ الحجر ہے جس کے آخر میں یہ الفاظ آئے ہیں: وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ ۝ "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں خوب معلوم ہے کہ جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس لیے اس سے آپ کا سینہ بھنچنے لگتا ہے آپ کو شدید ذہنی اذیت و کوفت ہوتی ہے[1]"۔

صدمہ ہوتا ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو کل تک میرے قدموں تلے اپنی آنکھیں بچھاتے تھے۔ جو مجھ کو دیکھتے ہی کہا کرتے تھے: جَاءَ الصَّادِقُ۔ جَاءَ الْاَمِیْنُ۔ ہر طرف حضورؐ کا خیر مقدم ہوتا تھا۔ ہر ایک آپؐ سے محبت کرتا تھا۔ ہر شخص آپؐ کا احترام کرتا تھا۔ لیکن یہی لوگ ہیں جو آج آپؐ کا استہزاء و تمسخر کر رہے ہیں۔ کوئی مجنون و دیوانہ کہہ رہا ہے کوئی شاعر و ساحر کہہ رہا ہے۔ قرآن مجید کے مسلسل درس کے سلسلہ میں ہم نے ابھی سورہ دخان کا مطالعہ ختم کیا ہے اس میں ان کفار کا یہ قول بیان ہوا ہے: وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ۝" اور انہوں نے کہا کہ یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تو (معاذ اللہ) سکھایا پڑھایا باؤلا ہے"۔ یعنی آپؐ کو کوئی اور سکھاتا پڑھاتا ہے اور یہ آکر ہم پر دھونس جماتے ہیں کہ یہ کلام مجھ پر اللہ کی طرف سے نازل

---

[1] اسی سورۃ الحجر میں حضورؐ کو بایں الفاظ تسلی بھی دی جاتی ہے: اِنَّا کَفَیْنٰکَ الْمُسْتَھْزِئِیْنَ ۝

رہا ہے۔ ذرا اندازہ لگایئے کہ حضورؐ کے قلبِ مبارک پر کیا گزرتی ہوگی جب یہ باتیں کہی جاتی ہوں گی اور آپؐ
کے متعلق یہ بھی کہا جاتا تھا کہ آپؐ پر کسی آسیب کا سایہ ہو گیا ہے ۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک روز حضورؐ
کی خدمت میں عتبہ ابن ربیعہ آتا ہے جو قریش کے بڑے سرداروں اور چودھریوں میں سے ہے ۔ یہاں
میں یہ بات بھی بتادوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاندین و مخالفین میں سے یہ شخص بڑا شریف النفس
تھا۔ میں بعد میں حضورؐ کے معاندین و مخالفین کی مزاجی اور نفسیاتی کیفیات کا تجزیہ آپ حضرات کے سامنے
پیش کروں گا۔ یہ آتا ہے اور بڑے ہی مخلصانہ و مشفقانہ اور بڑے ہی مربیانہ و ہمدردانہ انداز میں حضورؐ
سے کہتا ہے کہ "بھتیجے! اگر واقعی تم پر کسی بدروح کا سایہ ہو گیا ہے تو مجھے بتادو۔ میرے بہت سے عاملوں
اور ماہرفن کاہنوں سے تعلقات ہیں ۔ میں کسی کو بلا کے تمہارا علاج کرادوں گا۔"ؐ اب آپ سوچیئے کہ حضورؐ
کے قلبِ مبارک پر کیا گزری ہوگی! ۔ میں آپ کو یہ بتا رہا ہوں کہ یہ جو پہلا تشدد ہوا ہے اس کا نشانہ بحیثیت
ہدفِ اوّل جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تھی ۔ میں اس استہزاء و تمسخر کو بھی تشدد کہہ رہا ہوں
اس لیے کہ ذہنی اور نفسیاتی کوفت سے بڑا تشدد کوئی اور نہیں۔ جسمانی اذیت سے کہیں زیادہ تکلیف انسان
کو اس وقت ہوتی ہے جب اُسے یہ ذہنی کوفت پہنچتی ہے ۔ چنانچہ ابتدائی تین سال تک اعصاب شکنی
کی پوری کوشش ہوتی رہی ہے تاکہ آپؐ کے اعصاب ٹوٹ کر رہ جائیں، بکھر کر رہ جائیں۔ آپؐ میں وہ ہمت
ہی نہ رہے کہ کھڑے رہ کر دعوت پیش کرتے رہیں۔

ان کی طرف سے اس کی ایک اور انداز سے بھی کوشش ہوئی تھی ۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ بعض عامل لوگوں
نے باقاعدہ اپنی بہت سی ریاضتوں کے ذریعہ سے اپنی آنکھوں کے اندر ایک خاص کشش اور
چمک پیدا کرلی ہوتی ہے ۔ قوتِ ارادی کو اپنی آنکھوں میں مرتکز کرلیا ہوتا ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے
کسی کو گھور کر دیکھیں تو وہ جل کر رہ جائے اور اس کی قوتِ ارادی پاش پاش ہو جائے۔ یہ نفسیاتی مشقیں دنیا
میں ہر دور میں ہوتی رہی ہیں۔ آج کے دور میں تو اس نے ایک باقاعدہ فن کی صورت اختیار کرلی ہے ۔
معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ کوشش بھی کی گئی ۔ سورہ قلم میں فرمایا گیا ہے : وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ۝ "یہ کفار
جب 'الذکر' یعنی قرآن سنتے ہیں تو یہ آپؐ کو ایسی نگاہوں سے گھور کر دیکھتے ہیں گویا آپؐ کے قدم اکھاڑ دیں

---

اسی روایت میں آتا ہے کہ حضورؐ نے جواب میں اس کے سامنے سورہ حٰم السجدہ کی چند آیات کی تلاوت کی جس سے وہ انتہائی
متاثر ہوا۔ اس کے چہرہ کا رنگ متغیر ہوگیا اور وہ خاموشی سے واپس چلا گیا۔ قریش کے دوسرے سرداروں نے بھی اس تبدیلی کو
محسوس کیا اور ان کو اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں ربیعہ بھی حضورؐ پر ایمان نہ لے آئے۔ لیکن اسکی قسمت میں یہ شرف نہیں تھا۔ (مرتب)

گے (آپؐ کی آہنی قوتِ ارادی کو پاش پاش کر دیں گے) اور زبان سے کہتے ہیں کہ (معاذ اللہ) یہ ضرور مجنون و دیوانہ ہے"۔ ایک طرف وہ اپنے منہ سے جو استہزاء و تمسخر کر رہے ہیں اور جو الفاظ نکل رہے ہیں وہ قلب مبارک پر تیر کی طرح جا کر لگ رہے ہیں۔ یہ کوشش بھی اس لیے ہے کہ آپ کی ہمت کو توڑ کر رکھ دیں۔ آپؐ کے پائے ثبات میں لغزش آجائے۔ ساتھ ہی یہ اپنی نگاہوں کے ذریعہ سے بھی چاہتے ہیں کہ آپؐ کو متزلزل کر دیں۔ آپؐ کی ہمت جواب دے جائے۔ میرے نزدیک یہی توضیح و تشریح ہے لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ کی۔ چنانچہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ باقاعدہ اس قسم کے عاملین کی خدمات حاصل کی گئیں کہ وہ اپنی نگاہوں اور اپنی قوتِ ارادی سے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ ارادی کو پاش پاش کر کے رکھ دیں یہ ہوتا ہے اس تشدد کا پہلا دور۔ داعیٔ اوّل کو ذہنی کوفت پہنچانے کی ہر امکانی سعی و کوشش۔ اور ہمیں پہلے تین سال میں کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ کسی اور صاحبِ ایمان کے ساتھ یہ برتاؤ کیا گیا ہو۔ اس لیے کہ ظاہر بات ہے کہ ان کے نقطۂ نظر کے اعتبار سے فساد کی اصل جڑ تو داعیٔ اوّل ہی ہے جو یہ دعوت لے کر کھڑا ہوا ہے۔ لہٰذا کسی طریقہ سے اس جڑ کو ہلا دیں، اس کو اکھاڑ پھینکیں تو فساد ختم ہو جائے گا۔ ہمارے کچھ جوشیلے اور سر پھرے نوجوان ہیں اور ہمارے شرفاء میں سے بھی کچھ لوگ اس کی باتوں میں آگئے ہیں۔ لیکن اگر ہم نفسیاتی و ذہنی حملوں کے ذریعہ سے اسی داعیٔ اوّلؐ کو بد دل (Dis-hearted) کر دیں، اسی کے حوصلہ کو شکست دے دیں۔ اسی کی قوتِ ارادی کو ختم کر دیں تو یہ سب سے اچھا ہے۔ پھر کامیابی ہی کامیابی ہے۔

بس پہلے تین سال تو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بدترین ذہنی و اعصابی تشدد کا نشانہ بنے رہے۔ آغازِ وحی کے بعد چوتھے سال میں ان کے یہاں دار الندوہ میں باقاعدہ مشاورت کے بعد فیصلہ ہوا کہ اب تک جو تدبیریں ہم نے کی ہیں وہ سب ناکام ہو چکی ہیں۔ اور جنگل کی آگ کی طرح یہ دعوت پھیل رہی ہے گویا ع "نظام کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے"۔ پھر یہ کہ یہ آگ ہمارے بارود خانوں تک پہنچ گئی ہے اور ہمارے غلاموں کے طبقہ کے لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت کے حلقہ بگوش ہو گئے ہیں۔ اب کیا ہوگا! یہ فکر ان کے دامن گیر ہو گئی۔ آپ خود اندازہ کیجیے کہ غلاموں کا طبقہ اس معاشرے کے لیے بڑی افرادی قوت (Human Potential) کی اہمیت رکھتا تھا۔ وہ غلام اس نظام میں اپنی قسمت پر قانع تھے اور اس کے ساتھ خود کو Reconcile کر چکے تھے کہ ٹھیک ہے ہمارے نصیب میں یہی کچھ ہے۔ لیکن اگر کہیں ان کے اندر ان کی عزتِ نفس بیدار کر دی گئی۔ کہیں ان کے اندر یہ احساس پیدا ہو گیا کہ ہم بھی انسان ہیں اور ہمارے بھی کچھ حقوق ہیں تو کیا ہوگا! ہمارا نظام تلپٹ ہو کر رہ جائے گا۔ یہ طاقت اگر کہیں

ہمارے خلاف کھڑی ہوگئی تو اس کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ ان کی اس تشویش میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا کہ ان کے نوجوانوں میں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت نفوذ کر رہی ہے جو ایک بڑے خطرہ کی علامت ہے۔ اب آپ اندازہ کیجئے کہ عثمان ابن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کون ہیں! خاندانِ بنو امیہ کا ایک صالح نوجوان۔ معصب ابن عمیر کون ہیں! سعد ابن وقاص کون ہیں! حذیفہ ابن ربیعہ کون ہیں! عبداللہ ابن مسعود کون ہیں! رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ اونچے گھرانوں کے یہ نوجوان اور متعدد دوسرے نوجوان محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قدموں میں پہنچ گئے ہیں۔ لہٰذا کفارِ مکہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اب تک ہماری جو حکمت عملی تھی وہ کامیاب اور مؤثر ثابت نہیں ہوئی۔ لہٰذا فیصلہ ہوا کہ اب ان پر جسمانی تشدد کرو۔ ان کو مارو تاکہ ان کے ہوش ٹھکانے آجائیں۔ ہم میں سے جسکو بھی جس پر کوئی اختیار اور کوئی اقتدار حاصل ہے۔ وہ اُسے اُن پر استعمال کرے اور ان کو جور و تعدی اور ظلم و ستم کا نشانہ بنائے وہ اپنے آبائی دین کی طرف لوٹ سکیں۔ چنانچہ اس طرح آغاز وحی کے چوتھے سال اہل ایمان کے لیے جسمانی تشدد کا دور شروع ہوا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ابتدائی تین سال تو ذہنی تشدد اور Torture کا ہدف خاص طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس رہی۔ اب شدید قسم کی تعذیب، تعدی اور بہیمانہ ظلم و ستم کا ہدف بنے قریباً تمام اہل ایمان۔ مثلاً حضرت عثمانؓ ہیں۔ وہ غلام نہیں ہیں کوئی آقا تو ان کو نہیں مار سکتا۔ لیکن وہاں کے معاشرے کے اصول و رواج کے مطابق آنجنابؓ کا چچا موجود ہے جو بمنزلہ باپ ہے اور اُسے اپنے بھتیجے پر اختیار حاصل ہے اس نے حضرت عثمانؓ کو مارا بھی۔ اور بالآخر ایک چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھونی دے دی۔ اب دم گھٹ رہا ہے اور مرنے کے قریب ہیں۔ آخر کوئی وجہ تھی کہ جب پانچ سن نبوی میں حضورؐ نے چند صحابہؓ کو ہجرت حبشہ کی اجازت دی ہے تو حضرت عثمانؓ اور آپؓ کی اہلیہ محترمہ حضرت رقیہؓ، جو لختِ جگر ہیں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی، یہ دونوں ان میں شامل ہیں۔ جعفرؓ ابن ابوطالب بھی ان میں شامل ہیں۔ بنو ہاشم کے سردار کے بیٹے اور حضرت علیؓ کے بھائی۔ یہ لوگ غلام تو نہیں تھے۔ ورنہ غلام تو اپنے آقاؤں کے مملوک تھے وہ ہجرت کیسے کر سکتے تھے! لیکن وہاں بزرگوں کو خوردوں پر ایک اختیار حاصل تھا چاہے وہ خورد جوان ہی کیوں نہ ہوں۔ لہٰذا یہ نوجوان اور آزاد اہل ایمان اپنے گھر والے مشرکین کے تشدد اور مظالم کا نشانہ بن رہے تھے۔

لیکن اس سے بہت آگے بڑھ کر جور و ستم کا معاملہ ہوا ہے غلاموں کے ساتھ۔ ظاہر بات ہے کہ اس چکی میں سب سے زیادہ پسنے والے وہی لوگ تھے۔ ان کے تو کوئی حقوق تھے ہی نہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا وہ تو اپنے آقاؤں کے مملوک تھے۔ ان کے آقا انہیں ذبح کر دیں تو ان سے کوئی باز پرس نہیں

کرسکتا تھا۔کہ تم نے اسے کیوں ذبح کردیا!جیسے آپ کی بکری ہے آپ جب چاہیں اُسے ذبح کر دیں۔ کوئی آپ سے پُوچھ سکتا ہے! اگر کوئی پوچھنے کی حماقت کر بیٹھے تو آپ یہی جواب دیں گے کہ میری بکری تھی، میں نے ذبح کر دیا، آپ پوچھنے والے کون! یہی وجہ ہے کہ غلاموں کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کو سن کر سخت سے سخت دل میں بھی جھرجھری آجاتی ہے۔حضرت بلالؓ کے ساتھ امیہ ابن خلف نے جو کچھ کیا وہ آپ کے علم میں ہے۔لیکن کوئی نہیں ہے کہ اس سے پوچھ سکے کہ تم یہ کیا کر رہے ہو!۔ایک گوشت پوست کے زندہ انسان کے ساتھ وہ بہیمانہ سلوک کیا جارہا ہے جو اگر کسی مردہ جانور کے ساتھ بھی کیا جائے تو طبیعت میں ناگواری کا احساس پیدا ہوجائے لیکن کوئی پوچھنے والا نہیں ـــ اس وقت مکہ میں ایک اور طبقہ تھا جو حلیفوں کا طبقہ کہلاتا تھا۔جو نہ قریشی تھے، نہ غلام تھے۔بین بین کی ایک کیفیت تھی۔ یہ بات جان لیجئے کہ مکہ صرف ایک قبیلہ کا شہر تھا۔اس میں صرف قریش آباد تھے۔اور کوئی دوسرا قبیلہ آباد نہیں تھا ـــ اس تفاوت کو پیشِ نظر رکھیئے کہ تمدنی اعتبار سے مدینہ زیادہ ارتقائی مرحلہ پر تھا۔اس میں پانچ قبیلے آباد تھے۔عربوں کے دو قبائل اوس وخزرج اور یہودیوں کے تین قبائل بنو نضیر، بنو قینقاع اور بنو قریظہ۔جبکہ مکہ تمدنی اعتبار سے ابھی بالکل ابتدائی مرحلہ میں تھا اور صرف ایک قبیلے کا شہر تھا۔ اب اس میں یا تو قریش آباد ہیں یا ان کے غلام جو ان کی بھیڑبکریوں کا مقام رکھتے ہیں ـــ ایک تیسری کیٹیگری بھی تھی کہ کوئی شخص باہر کا آکر اگر خود کو قریش کی کسی بڑی شخصیت کی حمایت میں دے دے، اس کا حلیف بن جائے تو گویا وہ اس بڑے شخص کی حفاظت میں مکہ میں رہ سکتا ہے۔اس طرح اُس قریشی کو اس پر پُورا اختیار حاصل ہوجائے گا۔اس کی حیثیت اگرچہ غلام کی نہیں ہے لیکن وہ پُوری طرح آزاد بھی نہیں۔ وہ آزادوں اور غلاموں کے بین بین ایک تیسری مخلوق ہوگئی۔یہی معاملہ تھا حضرت یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا۔بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یمن کے رہنے والے ایک باعزت انسان تھے۔انہوں نے ایک خواب دیکھا تھا جس میں انؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بشارت ہوئی تھی۔اسی کے پیشِ نظر وہ مکہ میں آئے اور ایک شریف النفس بڑے شخص کے حلیف بن کر اور اس کی پناہ میں آکر مکہ میں بس گئے[1]۔ اسی شخص کی ایک کنیز تھی حضرت سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ تو آقا کی اجازت سے ان سے نکاح ہوگیا۔اب یہ ایک خاندان بن گیا۔ وہ شخص لاولد مرگیا۔اس کا جو شخص وارث اور جانشین بنا وہ ابوجہل تھا۔گویا اب وہی حیثیت آلِ یاسر پر ابوجہل کو حاصل ہوگئی۔حضرت یاسرؓ غلام تو نہیں ہیں لیکن ابوجہل کے حلیف اور اس کی پناہ میں ہیں۔اس لیے کوئی اور ابوجہل سے نہیں پوچھ سکتا کہ تم اس خاندان کے ساتھ کیا کر رہے ہو۔یہی وجہ ہے کہ اس دور میں مسلسل اور بدترین تشدد کا نشانہ بنے

---

[1] قریباً یہی معاملہ حضرت صہیب رومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تھا (مرتب)

ہیں یہ دو میاں بیوی اور ایک ان کے بیٹے حضرت عمارؓ یہ تینوں حضورؐ پر ایمان لے آئے تھے۔ ان پر شدید ترین مظالم ابوجہل نے کیے۔ حضرت سمیہؓ کو شوہر اور بیٹے کی نگاہوں کے سامنے انتہائی بہیمانہ طور پر شہید کیا۔ ایک مومنہ کا یہ پہلا خون تھا جس سے مکہ کی سرزمین لالہ زار ہوئی۔ پھر حضرت یاسرؓ کے ہاتھ پاؤں چار سرکش اونٹوں سے باندھ کر انہیں چار سمتوں میں ہانک دیا کہ انؓ کے جسم کے چیتھڑے اڑ گئے۔

میں نے بہرحال اس پہلے دور کو دو حصوں میں منقسم کر کے دکھا دیا کہ اس 'صبرِ محض' (Passive Resistance) کے دو دور تھے پہلے کا ہدف صرف حضورؐ تھے اور وہ تشدد تھا ذہنی کوفت کا۔ دوسرا دور جسمانی تشدد کا تھا۔ جس کا نشانہ تھے قریباً سارے اہلِ ایمان ۔۔ اب اگر میں تفصیلی واقعات مزید بیان کروں گا تو یہ مسئلہ بہت طویل ہو جائے گا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ اس وقت اس کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ انقلاب کے مرحلہ کے اعتبار سے کیا گیا ہے کہ بہرحال بارہ برس تک یہ حکم تھا کہ کسی تشدد، کسی ظلم، کسی زیادتی کے جواب میں ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ میں نے آج سورۂ نساء کی ایک آیت کی شروع میں تلاوت کی تھی۔ یہ نازل تو ہو رہی ہے ہجرت کے بعد مدینہ میں اور وہ بھی مدنی دور کے پانچویں یا چھٹے سال۔ اس میں یہ الفاظ آئے ہیں: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ ۔۔ "کیا تم نے دیکھا نہیں! ان لوگوں کی طرف جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو" میں اغلباً اس کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں کہ یہ حکم آپ کو مکی دور کی کسی سورت میں نہیں ملے گا۔ اس کا ذکر مدنی سورت میں آیا ہے وہ بھی پانچویں یا چھٹے برس ۔۔ یہ بھی ایک بہت اہم مثال ہے اس بات کی جو میں اپنی بعض تقاریر میں آپ کے سامنے پہلے بیان کر چکا ہوں کہ عمل کے اعتبار سے بسا اوقات سنّتِ رسُول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام قرآن مجید سے مقدم ہوتی ہے۔ مدنی سورت کی ایک آیت میں ذکر ہو رہا ہے اور اس اسلوب سے کہ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ۔ "کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو"۔ تو کہنے والا کون تھا؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ اس نوع کی کوئی آیت قرآن مجید میں موجود نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ حکم تھا جناب محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ جیسا کہ شاید میں عرض کر چکا ہوں کہ دونوں امکانات ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ یہ حضورؐ کا اپنا ذاتی اجتہادی فیصلہ ہو۔ اس کی اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نفی نہیں ہوئی تو توثیق ہو گئی جیسے کہ حدیث کی اقسام میں ایک "تقریری حدیث" ہے کہ حضورؐ کے سامنے ایک کام ہوا اور آپؐ نے اس سے اُسے روکا نہیں۔ تو اُسے بھی سنّت ہونے کی ایک سند حاصل ہو گئی۔ چونکہ اگر یہ کام غلط ہوتا تو حضورؐ منع فرما دیتے۔ تو یہ گویا اللہ کی طرف سے "تقریر" ہو گئی۔ مقرر کیے رکھنا۔ تقریر ہے۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ وحی خفی یا وحی غیر متلو کے ذریعے سے حضورؐ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہو اور اُسے آپؐ نے صحابہ کرامؓ تک پہنچا دیا ہو۔ اور بعد میں سورۂ نساء میں اُس وحی خفی کا اس وحی جلی اور وحی متلو میں ذکر آ گیا

کہ ان سے کہا گیا تھا: کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ ۔ "اپنے ہاتھ بندھے رکھو، روکے رکھو" ـــــ No Retaliation ـــــ کوئی جوابی کارروائی نہیں ہوگی۔ اور اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ 'No Raising of Hands even in Self Defence' ـــــ آگے فرمایا: وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ۔ اس وقت حکم یہ تھا کہ نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کرو۔ یعنی تربیت ہی کا تو مرحلہ تھا۔ ؎

باشہ درویشی درساز ودمادم زن ۔۔۔ چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

ابھی 'بر سلطنت جم زن' سے ٹکرانے کا حکم نہیں آیا تھا۔ بلکہ مرحلہ تھا تربیت کا۔ تیاری کرو۔ اللہ سے زیادہ سے زیادہ لو لگاؤ۔ اللہ کی محبت اور دلوں میں جماؤ۔ اپنے عزم و ارادہ کو اور تقویت دو۔ اللہ کی راہ میں مصائب و تکالیف جھیلنے کا خود کو زیادہ سے زیادہ عادی اور خوگر بناؤ۔ مجھے علامہ اقبال کا یہ شعر بڑا پسند ہے اگرچہ یہ ذرا مختلف بات ہے کہ ؎

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

تو جو ولولہ اور جوش صحابہ کرامؓ کے دلوں میں پیدا ہو رہا تھا کہ ہمیں باطل کے خلاف اٹھ جانا چاہیئے، کھڑے ہو جانا چاہیئے۔ لڑنا چاہیئے۔ چنانچہ سورۂ نساء کی اس آیت کی تفسیر میں آج صبح ہی میں نے دیکھا ہے کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے امام طبریؒ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں متعدد صحابہؓ مثلاً عبدالرحمٰن ابن عوف، سعد ابن ابی وقاص اور بعض دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا نام مذکور ہے ـ کہ یہ وہ حضرات تھے جو بار بار حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا کرتے تھے کہ اب قتال کا فیصلہ ہونا چاہیئے۔ کب تک ہم برداشت کریں گے! ـــ میں کہا کرتا ہوں کہ آپ سوچیے کہ جب مکہ میں حضرت سمیہؓ پر ظلم کیا جا رہا تھا۔ جو صنفِ نازک میں سے تھیں پھر بوڑھی بھی۔ تو کم از کم چالیس مسلمان موجود تھے۔ کیا ان کا خون کھولتا نہیں ہوگا؟ کیا وہ جوش میں نہ آتے ہوں گے اور حضورؐ سے عرض نہ کرتے ہوں گے کہ یا رسول اللہ! آپؐ کی ایک نام لیوا بوڑھی خاتون کو اس طرح بے عزت کیا جا رہا ہے اور ستایا جا رہا ہے! تو کیا ہم بے غیرت ہیں! کیا ہم میں مردانگی کا جوہر نہیں ہے! ہمیں اس بربریت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا چاہیئے، لیکن نہیں اس وقت حکم یہی تھا: کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ ۔ اپنے ہاتھ بندھے رکھو۔ ابھی اپنے اس جوش کو تھام کر رکھو۔ جلد وہ وقت آئے گا جب اپنا یہ جوش نکال لینا ـــ لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ انقلابی عمل کے اعتبار

سے حکمتیں اسی میں ہیں کہ جوش کو تھامو اور روکو۔ صبر کرو اور جھیلو۔ Retaliate نہ کرو یعنی مدافعت میں ہاتھ مت اٹھاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب سامنے سے گزر رہے ہیں تو تلقین فرما رہے ہیں: اِصْبِرُوْا یَا آلَ یَاسِرٍ فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃُ " اے یاسر کے گھر والو! صبر کرو اس لیے کہ تمہارے وعدہ کی جگہ جنّت ہے"۔

آگے بڑھنے سے قبل آیئے سورۂ نساء کی اس آیت نمبر ۷۷ کا مکمل مطالعہ کرلیں: فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ قِیْلَ لَھُمْ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ج فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیْھِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ یَخْشَوْنَ النَّاسَ کَخَشْیَۃِ اللّٰہِ اَوْ اَشَدَّ خَشْیَۃً ج وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ کَتَبْتَ عَلَیْنَا الْقِتَالَ ج لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ ط قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ ج وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰی قف وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ○

" (اے نبی) آپ نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے اور بندھے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو! اور اب جب کہ ان پر جنگ فرض کر دی گئی ہے تو ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں سے ایسے ڈر رہے ہیں جیسے اللہ سے ڈرنا چاہیئے۔ یا کچھ اس سے بڑھ کر۔ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم پر لڑنے کا فرض کیوں عائد فرمادیا! کیوں نہ ابھی ہمیں (تیاری اور تعداد کے اضافہ کے لیے) کچھ اور مہلت دی! (اے نبی) ان سے کہہ دیجئے کہ دنیا کی زندگی کا سرمایہ تھوڑا ہے اور آخرت اس کے لیے جو اللہ کا تقویٰ رکھتا ہے کہیں زیادہ بہتر ہے اور (وہاں آخرت میں) تمہاری حبہ برابر بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی"۔ بہرحال اس آیت کے ضمن میں یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت تو عمومی انداز میں دی ہے تو اس کا ذکر اس طور سے کر دیا گیا۔ ورنہ یہ نہ سمجھئے کہ صحابہ کرامؓ میں بہت سے لوگ تھے جو قتال سے ڈر رہے تھے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ صرف گنتی کے لوگوں کی قوتِ ارادی میں تزلزل ہوا ہو اور ان کے اعصاب پر کچھ تناؤ آیا ہو۔ تو ایسی بات کا اللہ تعالیٰ ایسے عام انداز میں ذکر فرمادیا کرتے ہیں تاکہ کسی کے دل میں ذرا سی بھی لرزش کے آثار پیدا ہو رہے ہوں تو وہ ذہن

رک جائے اور متنبہ ہو جائے اور پھر اپنی قوتِ ارادی کو مضبوط کر لے اور اس کے سامنے یہ بات واضح طور پر آجائے کہ دنیا فانی ہے ایک دن تو انسان کو موت سے ہمکنار ہونا ہی ہونا ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کی موت راہِ حق کے لیے جدوجہد کرنے میں آئے۔

پس تو یہ ابتدائی دور ہے جو قریباً ساڑھے بارہ برس مکہ میں جاری رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دور انقلابِ محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کا ناگزیر بنیادی لازمہ (Pre-requisite) ہے۔ اسی میں انقلابی فکر یہ وفکر کی دعوت وتبلیغ بھی ہو رہی ہے۔ دعوت قبول کرنے والوں کی تنظیم بھی ہو رہی ہے۔ اسی میں اہلِ ایمان کے تزکیہ اور تربیت کے مراحل بھی طے پا رہے ہیں۔ اسکے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ انکے روحانی تزکیہ اور ترفع کا پروگرام بھی چل رہا ہے۔ دوسرا یہ کہ ماریں کھانے، مصائب جھیلنے کا انکو خوگر بنایا جا رہا ہے اور پھر یہ کہ انکو ڈسپلن کی پابندی کا عادی بنایا جا رہا ہے[1]۔ اور ان کی قوتِ برداشت، ان کی قوتِ ارادی کو چٹان کی مانند مضبوطی بھی حاصل ہو رہی ہے۔ گویا تطہیرِ افکار اور تعمیرِ سیرت وکردار کے دونوں کام ساتھ ساتھ چل رہے ہیں — میں پھر عرض کروں گا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین معاذ اللہ بزدل نہیں تھے (العیاذ باللہ) کہ خاموشی سے ماریں کھاتے رہے اور ظلم وستم اور عقوبت وتعذیب جھیلتے رہے۔ بلکہ یہ اس لیے تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا۔ کُفُّوٓا اَیۡدِیَکُمۡ۔ اجازت جب تک نہ ہو ہاتھ نہ اٹھیں۔ پھر سُن لیجئے کہ یہ حکم قرآن میں نازل نہیں ہوا تھا[2]۔ یہ حکم تھا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ پوچھا تک نہیں کہ قرآن میں کہاں آیت اتری ہے کہ ہم ہاتھ نہ اٹھائیں۔ لہٰذا جان لیجئے علامہ اقبال کا یہ شعر صد فی صد صحیح ہے کہ ؎

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

---

[1] غور کیجیے کہ اس سے بڑی ڈسپلن کی پابندی اور کیا ہو سکتی ہے کہ چاہے تمہارے ساتھ یا تمہارے کسی رفیق کیساتھ یا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کتنا ہی ہولناک اور ناقابل برداشت معاملہ کیا جائے ظلم وستم کے کتنے ہی پہاڑ توڑے جائیں تم ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ اس طرح گویا نظم سمع وطاعت کی تربیت بھی ہو رہی ہے (مرتب)

[2] واضح رہے کہ پورے مکی قرآن میں یہ الفاظ کہیں وارد نہیں ہوئے۔ بعد میں امرِ واقعہ کے اظہار کے طور پر سورۃ نساء میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں جو مدنی سورۃ ہے۔

"اپنے آپ کو مصطفیٰؐ کے قدموں تک پہنچاؤ اس لیے کہ دین تو نام ہی مصطفیٰؐ کا ہے۔ وہاں تک رسائی نہیں ہوئی تو اس کے باہر تو بولہبی یعنی کفر، زندقہ اور ضلالت ہی ضلالت ہے"۔

یہ قرآن جس پر ہمارا ایمان ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے ہمیں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ملا ہے۔ یہ مجھ پر یا کسی اور پر تو نازل نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ ابوبکر، عمر، عثمان، علی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین وارضاہم پر بھی نازل نہیں ہوا۔ رسول اللہ پر قرآن بھی نازل ہوا اور نہ معلوم اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مزید کیا کیا نازل فرمایا ہے! حضورؐ کا ارشاد ہے: اُوتِیتُ القُرآنَ وَمِثلَهُ مَعَهُ۔" مجھے قرآن بھی ملا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی مثل اور بھی ملا ہے"۔ اللہ تعالیٰ نے حکمت دی ہے، بصیرت دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بے پناہ صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ پھر وحی خفی ہے۔ بہت سی باتیں اللہ تعالیٰ بذریعہ الہام حضورؐ کو پہنچا رہا ہے۔ کبھی خواب کے ذریعے سے رہنمائی دی جا رہی ہے۔ کبھی کشف ہو رہا ہے۔ یہ سب چیزیں بھی اللہ تعالیٰ کی تعلیم کا ایک حصہ ہیں جو اس نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی۔

ہاتھ نہ اٹھانے کی بہت سی حکمتوں میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ عادت پڑ رہی ہے اور خوگر ہو رہے ہیں سمع وطاعت کے۔ ہاتھ نہیں اٹھانا! جھیلنا ہے، برداشت کرنا ہے اور صبر کرنا ہے۔ ساتھ ہی ایک حکم اور بھی ہے کہ پیچھے نہیں ہٹنا۔ موقف پر ڈٹے رہنا ہے۔ یہ نہ ہو کہ اس تشدد سے گھبرا کر اپنے انقلابی نظریہ کو خیر باد کہہ دو۔ اس سے کنارا کش ہو جاؤ۔ نہیں! ڈٹے اور کھڑے رہنا ہے۔ جان جاتی ہے تو جائے۔ یہ ہے اس تصادم کا پہلا مرحلہ صبر محض یا Passive Resistance ——— میں نے اس بارے میں مختلف مواقع پر تقاریر کی ہیں۔ بعض لوگوں نے اس سے غلط نتیجہ اخذ کیا۔ دو سال پہلے مجھے اسلام آباد میں تقریر کر کے وہیں سے دعوتی دورے پر امریکہ جانا تھا۔ اسلام آباد میں میں نے سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے موضوع پر تقریر کی تھی جس میں اس Passive Resistance کا بھی ذکر تھا۔ بعض اخبارات میں اس کی رپورٹنگ غلط انداز میں ہوئی اور خواجہ صفدر صاحب نے میرے خلاف ایک بیان داغ دیا تھا۔ مجھے وطن واپس آکر معلوم ہوا ـــ میں اصل میں کہتا یہ ہوں کہ اغیار نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ ومبارکہ سے بہت سے سبق حاصل کیے ہیں۔ اس کی مثالوں میں سے ایک مثال مسٹر گاندھی کی ہے

گاندھی نے عدم تشدد کا جو نظریہ اختیار کیا وہ درحقیقت حضورؐ کی سیرت سے ماخوذ ہے۔ اس لیے کہ اس سے پہلے یہ چیز صرف دو جگہ نظر آتی ہے۔ یا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں مسلسل بارہ برس۔ اس سے بڑا اور طویل عرصہ کہیں نظر آئے گا ہی نہیں۔ یا پھر وہ تین سال جو حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تھے۔ اس کو بھی لوگوں نے غلط سمجھا ہے اور بعض مسلمان بھی غلط فہمی میں یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ موجودہ اناجیل میں اس ضمن میں آں جنابؑ کے جو اقوال ملتے ہیں وہ آپؑ کے فرمائے ہوئے نہیں ہیں۔ انجیل میں چونکہ تحریف مسلّم امر ہے لہٰذا سمجھا یہ جاتا ہے کہ یہ باتیں کسی اور کی ہونگیں جو حضرت عیسیٰؑ سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ جملے آں جنابؑ ہی کے فرمائے ہوئے ہیں۔ صرف ان کا موقع و محل سمجھنے کی ضرورت ہے۔ غور کرنے سے ان کا مطلب واضح ہو جاتا اور سمجھ میں آجاتا ہے۔ آنجنابؑ کے اقوال یہ ہیں کہ "اگر کوئی تمہارے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو بایاں بھی پیش کر دو"۔ اور یہ کہ "اگر کوئی نالش کر کے تمہارا چوغہ لینا چاہے تو تم کُرتا بھی اتار کر دے دو"۔ اور۔ "تمہیں کوئی بیگار میں اپنے ساتھ ایک کوس لے جانا چاہے تو تم دو کوس جاؤ۔" یہ درحقیقت بالکل ابتدائی اور تمہیدی دور کی تعلیم ہے جس میں دعوت و تبلیغ کے ساتھ ہی مصائب و تشدد کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام صبر محض اور ایثار و قربانی کی یہ تعلیم دے رہے ہیں تاکہ ایک طرف معاندین و مخالفین کا بغض و خبثِ باطنی آشکارا ہو جائے۔ دوسری طرف اہلِ ایمان میں قوت برداشت پیدا ہو۔ اب یہ مشیت الٰہی تھی کہ اسی صبر محض یعنی Passive Resistance کے دور میں کہ آں جنابؑ کا رفع آسمانی ہو گیا۔ گو کہ یہودیوں نے تو اپنی دانست میں آنجنابؑ کو صلیب پر چڑھا کر دم لیا تھا۔ عیسائیوں کی عظیم ترین اکثریت بھی ایسی غلط فہمی میں مبتلا چلی آرہی ہے۔ جبکہ انجیل برنباس میں وہی باتیں بیان ہوئیں جو قرآن میں ہوئی ہیں اور جو حقیقت و صداقت پر مبنی ہیں۔ کتاب و سنت کے مطابق آپؑ بجسدِ شریف زندہ آسمان پر اٹھا لیے گئے۔ وہاں جسم و روح کے تعلق و اتصال کے ساتھ حیات ہیں۔ قرب قیامت میں آنجنابؑ کا نزول ہوگا۔ آپؑ بنفسِ نفیس آسمان سے نزول فرمائیں گے۔ آپؑ کے ہاتھ میں تلوار بھی ہوگی یعنی آپؑ قتال فرمائینگے۔ اور سیرتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مدنی دور کی بھی جھلک دنیا سیرتِ عیسوی علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام میں دیکھ لے گی۔ آپؑ اس نزول کے وقت نبی و رسول آخر الزماں جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہوں گے۔ آپؑ کے

ہاتھوں یہودیوں کو عذابِ استیصال کا مزا چکھنا ہوگا۔ دجّال اکبر آں جنابؑ کے ہاتھوں قتل ہوگا۔ یہودی دنیا سے اسی طرح نیست ونابود کر دیئے جائیں گے۔ جیسے قوم نوح، قوم عاد و ثمود، قوم لوط و مدین وغیرہ وقت کے رسُولوں کی تکذیب کے جرم میں اس دنیا سے بھی نسیًا منسیًا کردی گئیں اور آخرت کا عذاب تو ان کا مقدر ہے ہی۔

سیرتِ عیسوی میں چونکہ 'اقدام' یعنی ' Active Resistance ' کا دور آیا ہی نہیں۔ لہٰذا مسلح تصادم کا دور کیسے نظر آتا!۔ ویسے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام نیا نظامِ شریعت لے کر تشریف نہیں لائے تھے بلکہ شریعت موسویؑ کی تجدید و احیاء کے لیے مبعوث ہوئے تھے چنانچہ موجودہ اناجیل میں آپؑ کے پہاڑی کے وعظ میں یہ قول آج بھی موجود ہے کہ "جہاں تک قانونِ شریعت کا تعلق ہے میں اسے بدلنے نہیں آیا۔ قانون تورات ہی کا نافذ رہے گا"۔ قرآن میں قصاص کا قانون تورات کے حوالے سے بیان ہوا ہے اور شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں تورات کے اس قانون کو باقی رکھا گیا ہے۔ تو کیسے ممکن تھا کہ قصاص کے اس قانون کو حضرت مسیحؑ ساقط کر دیتے۔ لیکن قانون اور ہوتا ہے۔ دعوت و تبلیغ کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں۔ دعوت و تبلیغ کے ابتدائی دور میں کسی طرح بھی قصاص کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس موقع پر حکم ہوتا ہے 'کُفُّوا اَیْدِیَکُمْ'۔ حضرت مسیحؑ کے اقوال میں اگر تدبر اور غور و فکر سے کام لیا جائے، تو وہاں یہی حکمت کارفرما نظر آتی ہے۔

ویسے تورات کا قصاص کا یہ قانون پوری دنیا میں زبان زدِ عام ہوگیا تھا کہ 'آنکھ کے بدلے آنکھ۔ کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور جان کے بدلے جان'۔ لیکن دیکھ لیجئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قصاص کے اس آفاقی و مسلمہ قانون کی بجاآوری سے صحابہ کرامؓ کو روک رکھا تھا۔ ورنہ میں کہا کرتا ہوں کہ اگر ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہوتی تو بلالؓ صبر و سکون کے ساتھ امیہ ابن خلف کے بہیمانہ تشدد کا نشانہ نہ بنتے۔ جان پر کھیل جاتے اور اس ظالم کو مزا چکھا دیتے۔ کیا جو ذہنی اور جسمانی کوفت و اذیت مکہ کی گلیوں میں مردہ جانور کی طرح کھینچے جانے کے باعث ہو رہی تھی۔ وہ جان دینے سے کم تھی!۔ اگر اجازت ہوتی تو خبابؓ ابن ارت ننگی پیٹھ دہکتے ہوئے انگاروں پر لیٹنے کے بجائے کیا دو چار کو ساتھ لے کر نہ مرتے۔ ایک شخص دیکھ رہا ہے کہ یہ سارا اہتمام میرے لیے ہو رہا ہے۔ یہ دہکتے انگارے میرے لیے بچھائے جا رہے ہیں۔ ان سے

کہا جاتا ہے کہ کُرتا اتارو اور وہ اتار دیتے ہیں۔ ان انگاروں پر لیٹ جاؤ اور وہ لیٹ جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے اور نہ آدمی پس وپیش کرتا ہے۔ آدمی Desperate ہو جائے تو اس میں بے پناہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ کمزور بھی ہو تو بھی ایسے شخص میں مقابلے کی زبردست طاقت عود کر آتی ہے۔ میں مثال دیا کرتا ہوں کہ اگر بلی کہیں گھیرے میں آجاتی ہے اور اسے پتہ چلے کہ مجھے راستہ نہیں ملتا تو وہ انسان پر حملہ کرتی ہے۔ اس لیے کہ وہ جان لیتی ہے کہ اس کے سوا اس کے لیے کوئی چارہ نہیں۔ لیکن وہاں اجازت نہیں ہے۔ تو یہ بات بہت اہم ہے۔ معاذ اللہ بزدلی کا وہاں معاملہ نہیں تھا۔ نہ معاذ اللہ بے غیرتی اور بے حمیتی کا کوئی معاملہ تھا کہ اہلِ ایمان یہ تشدد اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں لیکن حرکت نہیں کرتے۔ یہ فلسفۂ انقلاب ہے اور گاندھی نے عدم تشدد کا فلسفہ سیکھا ہے تو یہاں سے۔ البتہ گاندھی کی حماقت یہ ہے کہ اس نے اسے مستقل فلسفہ بنا لیا۔ یہ فلسفہ ایک دور کا فلسفہ ہے یہ کوئی مستقل فلسفہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس درجے میں عدم تشدد کہ جس درجہ میں بعد میں جا کر گاندھی نے اس کی تبلیغ کی۔ وہ نری حماقت ہے۔ جن لوگوں کی نظر سے مولانا آزاد کی کتاب 'INDIA WINS FREEDOM' گزری ہے، ان کے علم میں ہو گا کہ وہ گاندھی کے اس فلسفہ کا مذاق اڑاتے ہیں کہ گذشتہ جنگِ عظیم میں گاندھی نے اتحادیوں کو ہٹلر کے آگے عدم تشدد کے فلسفہ کے تحت ہتھیار ڈال دینے کی تلقین کی تھی۔ عدم تشدد کے فلسفہ کو اس سطح تک لائیں گے تو یہ پاگل پن ہے۔ لیکن ہاں ایک انقلابی تحریک اپنے ابتدائی مرحلہ میں اسے اختیار کرتی ہے۔ گاندھی نے اس سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اس لئے کہ اگر شروع میں کانگریس کی پالیسی میں عدم تشدد کی پالیسی نہ ہوتی تو انگریز آناً فاناً پوری تحریک کو کچل کر رکھ دیتا اور تحریک آگے نہ بڑھ سکتی۔ حکومت کے ہاتھ بندھ گئے تھے کہ کیا کرے؟ تشدد کر نہیں رہے۔ اسے عالمی رائے عامہ کا بھی لحاظ رکھنا تھا

میں اس کی ایک مثال آپ کو پہلے بھی سنا چکا ہوں آج پھر سنا دیتا ہوں۔ اس کے راوی اور چشم دید گواہ آج بھی الحمد للہ بقیدِ حیات ہیں۔ حاجی عبد الواحد صاحب ایم۔ اے، ۴۹ علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو) یہاں کی رہائش ہے جو شخص چاہے ان کے پاس جا کر اس کی توثیق کر لے ___ سکھوں کی ایک تحریک تو اب چل رہی ہے۔ یہ تو بالکل برعکس ہے۔ یہ تو Voilent ہو گئی۔ خونریزی پر اتر آئی ہے۔ اس کا نتیجہ بھی سامنے آرہا ہے کہ بھارت کی موجودہ حکومت اسے پوری طاقت کے ساتھ کچلنے میں مصروف ہے۔ لیکن ایک تحریک سکھوں

کی طرف سے آج سے قریباً پچپن سال قبل یعنی ۱۹۲۰ء میں چلائی گئی تھی۔ جو لوگ اسے پہلی بار سن رہے ہیں وہ یقیناً یہ سن کر حیران ہوں گے کہ سکھوں کے گوردواروں کے ساتھ جو اوقاف تھے ان پر قبضہ ہندوؤں کا تھا۔ چونکہ سکھوں کے بارے میں پورے طور پر یہ متعین نہیں تھا کہ یہ کوئی علیحدہ مذہب ہے۔ ہندو یہ سمجھتے تھے کہ یہ ہندو مت ہی کا ایک فرقہ ہے۔ لہٰذا سکھوں کے گوردواروں کے اوقاف پر ہندو قابض تھے اور ان کی آمدنی میں اپنی مرضی کے مطابق تصرّف کرتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ کچھ بڑے لوگ پٹواریوں کی مٹھی گرم کرکے کاغذات اور دستاویز تبدیل کرا کے انہیں ذاتی ملکیت بنا لیتے تھے[1]۔ سکھوں نے تحریک چلائی کہ ہمارے گوردواروں اور ان کے اوقاف کا کنٹرول ہمارے پاس ہونا چاہیئے۔ یہ کیا تماشہ ہے کہ عبادت گاہیں ہماری اور ان کے ساتھ جو املاک و اوقاف ہیں وہ ہندوؤں کے ہاتھ میں ہیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ہندو کی رسائی انگریز کے دربار میں بہت ہو چکی تھی۔ انگریز کو ہندوؤں کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ سکھ چونکہ ایک جنگجو قوم تھی اور قریباً پون صدی قبل انگریزوں نے پنجاب کی حکومت سکھوں سے چھینی تھی تو انگریزی حکومت سکھوں سے اسی طرح خائف رہتی تھی جیسے مسلمانوں سے۔ سوائے پنجاب کے مسلمانوں کے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز نے ہی پنجاب کے مسلمانوں کو سکھا گردی اور مظالم سے نجات دلائی تھی۔ لہٰذا انگریزی حکومت کے خلاف دشمنی کے جذبات پنجاب کے مسلمانوں کے نہیں تھے جو ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کے تھے ——

—— اس لئے کہ پنجاب کے مسلمان سکھوں کی حکومت میں انتہائی ذلّت و خواری کی غلامی میں مبتلا رہے تھے۔ لہٰذا وہ انگریز کی حکومت سے عموماً خوش رہے اور اس کو غنیمت خیال کرتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اگر پنجاب کے مسلمانوں کے فوجوں نے انگریز کی مدد نہ کی ہوتی تو اسی وقت ہندوستان سے انگریز کا نام نشان مٹ جاتا۔ یہ باتیں برسبیل تذکرہ زبان پر آگئیں۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ انگریز سکھوں سے بھی کسی نہ

---

[1] جیسے ہمارے یہاں مزارات ہیں۔ ان کے ساتھ اوقاف ہیں تو گدّی نشین صاحبان ان کے ایک طرح مالک ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی جب اوقاف ایکٹ بنا تو ان گدی نشینوں میں سے بھی بڑی اکثریت نے پٹواریوں کی مٹھی گرم کر کے بہت سی املاک کے لئے اپنے حق میں کاغذات اور دستاویزات تبدیل کرالیں اور اب ان کی آمدنی پر عیش کر رہے ہیں۔

کسی درجہ میں اسی طرح الرجک تھا جیسے کہ بقیہ ہندوستان کے مسلمانوں سے تھا۔ لہٰذا انگریز نے ہندوؤں کی پشت پناہی کی اور سکھوں کے اس معقول مطالبہ کو رد کر دیا۔ اور پولیس کو تو حکومت کی شہ اور پیسہ چاہیئے۔ لہٰذا اس کی طرف سے بھی ہندوؤں کا پورا پورا ساتھ دیا گیا۔ حاجی عبدالواحد صاحب جو امرتسر کے رہنے والے ہیں بتاتے ہیں اور وہ عینی شاہد ہیں کہ بالآخر سکھوں نے اس تحریک کو عدم تشدّد کے اصول پر چلانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ احتجاج کے لئے سکھوں کا جو جتھا نکلتا تھا اس کو حکم تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھیں۔ ہر جتھا عموماً پچاس رضاکاروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اغلباً دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی۔ لہٰذا قانون کی خلاف ورزی ہوگئی۔ اور پولیس کو اختیار حاصل ہوگیا کہ ان پر لاٹھی چارج کرے، ڈنڈے چلائے اور ان کو منتشر کر دے ــــ ادھر ان رضاکاروں کو یہ حکم تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھیں اور ماریں کھائیں لیکن پیچھے نہ ہٹیں۔ حاجی صاحب بتاتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ لاٹھیاں پڑ رہی ہیں، سر پھٹ گیا ہے، سکھ رضاکار زمین پر گر گیا ہے۔ لیکن اس کے ہاتھ نہیں کھلے۔ وہ بندھے رہے۔ جتھے کے تمام رضاکار اسی طرح زخمی ہو کر گرتے رہے لیکن کیا مجال کہ کسی کے ہاتھ کھلے ہوں۔ ایک جتھا اسی طرح بُری طرح زخمی ہوگیا تو اس کی جگہ لینے دوسرا جتھا آگیا ــــ میں نے جب حاجی صاحب سے یہ واقعہ سنا تو میں حیران رہ گیا اور میرا ذہن قرآن کے ان الفاظ کی طرف منتقل ہوگیا: کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ ــــ یہ ہے صبرِ محض یعنی Passive Resistance۔ اس میں بڑی طاقت ہے۔ اس میں بڑی تاثیر ہے۔ یہ انسان کی قوّتِ ارادی کا مظاہرہ ہے۔ اس میں اس عزم کا اظہار ہے کہ "ہرچہ بادا باد"۔ پھر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ یہ کوئی بے ترتیب ہجوم نہیں ہے ــــ بلکہ نظم و ضبط کی عادی (Disciplined) جماعت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کو جو حکم دیا جاتا ہے اسے وہ پورا کرتے ہیں۔ ان دو چیزوں کا مظاہرہ (Demonstration) ہو جائے تو اس میں بڑی قوّت ہے۔ چنانچہ انگریز کو جھکنا پڑا ــــ اور سکھوں کی تحریک کامیاب ہوئی۔ اور ان کے گوردواروں کے اوقاف کا انتظام و انصرام ان کو مل گیا ــــ

گاندھی کا واقعہ آتا ہے کہ ۲۱-۱۹۲۰ء میں عدم تشدّد کی بنیاد پر انہوں نے ترکِ موالات کی جو تحریک تحریکِ خلافت کے ساتھ مل کر چلائی تھی تو اس کے دوران پورے ہندوستان میں صرف ایک جگہ عدم تشدّد کے اصول کی خلاف ورزی ہوئی۔ صوبہ بہار کا چورا چوری کے نام کا

ایک قصبہ تھا۔ اس کا ایک تھانہ تھا۔ پولیس والوں نے کچھ شرارت کی اور جو جلوس نکلا ہوا تھا اس میں بعض لوگ مشتعل ہو گئے اور انہوں نے تھانے پر حملہ کیا' بہت سے سپاہیوں کو مار دیا اور تھانہ میں آگ لگا دی جس میں کچھ پولیس والے زندہ جل کر مر گئے۔ اب آپ دیکھئے کہ گاندھی نے صرف اس ایک حادثہ پر پوری تحریک ختم ( Call off ) کر دی۔ اس وقت گاندھی کی زندگی میں بڑا نازک مرحلہ آیا تھا۔ پورے ہندوستان میں اس کے خلاف جذبات مشتعل ہو گئے کہ کیسا لیڈر ہے کہ اس نے تحریک ختم کر دی۔ ایسے موقع پر تو عموماً لوگ لیڈر کو گالیاں دیتے ہیں۔ لیکن گاندھی نے اپنی لیڈری کی موت کا خطرہ مول لیا کہا تو یہ کہا کہ اگر تم میرے حکم پر نہیں چل سکتے تو میں رہنمائی کی ذمّہ داری نہیں لے سکتا۔ میرا حکم یہ ہے کہ تمہیں ہاتھ نہیں اٹھانا۔ تشدّد نہیں کرنا۔ تم تشدّد کر رہے ہو تو گویا تم میرا حکم ماننے کو تیار نہیں ہو۔ میں اس تحریک کی رہنمائی کی ذمّہ داری کیسے قبول کر لوں کہ جس کے بارے میں مجھے یہ اعتماد نہ ہو کہ اس تحریک میں حصّہ لینے والے میری بات کو مانیں گے۔ گاندھی کی بڑی معقول بات تھی ــــ گاندھی کا ذکر اگر میں کرتا ہوں تو اس اعتبار سے نہیں کہ معاذ اللہ وہ میرے لئے کوئی حجّت ہے یا کوئی دلیل ہے یا رہنمائی کے لئے کوئی مثال ہے۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ گاندھی نے یہ اصول سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام سے سیکھا ہے۔ اس کے شواہد موجود ہیں کہ گاندھی کا اسلام کا مطالعہ تھا ــــ میں آج اس کے لئے دو مثالیں پیش کر دیتا ہوں ــــ

میں حال ہی میں دعوتی دورے پر حیدر آباد دکن گیا تھا۔ وہاں میں نے متعدد تقریریں کیں اور قرآن حکیم کے درس بھی دیئے ــ تو ایک صاحب جو عثمانیہ یونیورسٹی کے ہیڈ آف پولیٹیکل سائنس کی پوسٹ سے ریٹائر ہوئے تھے انہیں میری فلسفۂ انقلاب والی تقریر بہت پسند آئی۔ وہ بہت متاثر ہوئے۔ بعد میں وہ مجھ سے ملنے آئے۔ انہوں نے میری باتوں کی توثیق کے لئے بہت سے واقعات بتائے۔ انہوں نے علی گڑھ سے ایم اے کیا تھا۔ انہوں نے ایک واقعہ سنایا۔ جو غالباً ۱۸ء یا ۱۹ء کا ہے۔ اس وقت وہ وہاں پڑھتے تھے۔ جنوبی افریقہ میں گاندھی نے نسلی امتیازات کے خلاف جو تحریک چلائی تھی' اس کی وجہ سے وہ پوری دنیا میں مشہور ہو گئے تھے۔ کالج میں اعلان ہوا کہ گاندھی کالج آ رہے ہیں۔ اس وقت تک علی گڑھ کو یونیورسٹی کا درجہ حاصل نہیں تھا۔ لوگوں میں بڑا اشتیاق پیدا ہوا۔ وہ صاحب

بتاتے ہیں کہ گاندھی آئے اور سیدھے اس کمرے میں چلے گئے جس میں سر سید احمد خاں مرحوم کی قبر ہے۔ وہاں وہ اکیلے پون گھنٹے تک سر سید مرحوم کی قبر کے پائنتی بیٹھے رہے۔ ایسا کیوں ہوا! یہ اللہ جانے۔ گاندھی جب باہر آئے تو منتظمین اور طلبہ نے ان سے جلسہ سے خطاب کے لئے کہا۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں تو صرف سر سید صاحب کی قبر کی زیارت کے لئے آیا تھا۔ مجھے اور کوئی کام نہیں ہے۔ جب بہت زور دیا گیا تو گاندھی نے کہا کہ پہلے میں پورے کالج اور ہوسٹل کا ایک چکر (Round) لگانا چاہتا ہوں۔ اس وقت ہوسٹل کی وہ صورت نہیں تھی جو آجکل ہے۔ اس وقت علی گڑھ میں نواب زادوں، جاگیرداروں اور بڑے بڑے رئیسوں کے لڑکے پڑھتے تھے۔ تو ہر ایک کے کمرے میں قالین بچھے ہوئے اور صوفے لگے ہوئے تھے۔ کالج کے طلبہ بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے۔ گشت کے بعد گاندھی نے ہال میں تقریر کی اور تقریر میں انہوں نے مختصر سی باتیں کہیں۔ جن میں دو باتیں قابل ذکر ہیں ایک یہ کہ میں آپ حضرات کو خوشخبری دیتا ہوں کہ آپ کا یہ کالج جلد ہی یونیورسٹی بن جائے گا اس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔" دوسری خاص بات یہ کہی "اگر آپ کا کالج یا آپ کی یونیورسٹی ایک بھی حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) پیدا کر دے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ لیکن میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ آپ کا کالج یا یونیورسٹی ایک بھی حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) پیدا نہیں کر سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے آپ کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ لئے ہیں، صوفوں اور قالینوں پر پڑھنے والے حضرت عمر نہیں بن سکتے۔" آپ بتائیے کہ اس کا کتنا گہرا مطالعہ تھا۔ کیا حضرت عمرؓ کو جانے بغیر کوئی شخص یہ بات کہہ سکتا ہے! —— میں نے جب ان سے یہ واقعہ سنا تو فوراً میرا ذہن علامہ اقبال مرحوم کی اس نظم کی طرف منتقل ہوا جو علامہ نے اسی زمانہ میں کہی تھی جس زمانے کا یہ واقعہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ گاندھی کی اس بات کی اخبارات میں رپورٹنگ ہوئی ہوگی اور شاید علامہ نے اسی سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا ہوگا کہ ؎

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالین ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

بہرحال یہ ایک خیال ہے۔ اب کوئی اس کی تحقیق کرے تو بات واضح ہو سکے گی۔
—— گاندھی کی بعد والی دوسری بات بہت مشہور و معروف ہے کہ جب ۱۹۳۷ء میں بہت سے صوبوں میں انڈیا ایکٹ ۳۵ء کے تحت کانگریس کی پہلی بار وزارتیں بنیں تو گاندھی نے اپنے

اخبار ہریجن میں لکھا اور شاید تمام وزراءِ اعلیٰ کو خطوط بھی لکھے ہوں جس کا مفہوم یہ تھا کہ "میں تمام وزیروں سے کہتا ہوں کہ حکومت میں حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کی مثال سامنے رکھنا۔ جنہوں نے درویشی میں ایک عظیم ترین سلطنت کی سربراہی کی ہے"! اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ اسلام کے پہلے قرنِ سعید کا گاندھی کا مطالعہ کتنا تھا! ۔ بہرحال میں گاندھی کے عدم تشدد کی بات کرتا ہوں تو اس اعتبار سے کہ انہوں نے یہ سبق سیرت النبی سے سیکھا ہے[1] علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام!

بات صبرِ محض یعنی *Passive Resistance* کی ہو رہی تھی۔ جو فلسفۂ انقلاب کی شرطِ اوّلین (*Pre Requisite*) ہے۔ ہمارے یہاں بھی تحریکیں چلتی ہیں گو وہ انقلاب کے لئے نہیں ہوتیں۔ صرف ایک ناپسندیدہ حکمران یا پارٹی کو ایوانِ حکومت سے بے دخل کرنے کے لئے ہوتی ہیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ تحریک کے قائدین کہا کرتے ہیں کہ جلوس تو ہم نے نکالا لیکن توڑ پھوڑ کوئی اور کر گیا۔ عجیب بات ہے۔ آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ آپ سڑکوں پر آئیں۔ اگر آپ کی اتنی تنظیم نہیں ہے۔ اگر آپ کا اتنا کنٹرول نہیں ہے اگر آپ کا اتنا ڈسپلن نہیں ہے۔ جلوس نکل رہا ہے حکومتِ وقت کے خلاف اور شامت آرہی ہے قومی املاک کی۔ کہیں اسٹریٹ لائٹیں توڑ دی گئی ہیں۔ کہیں نیون سائن اور اسٹریٹ سگنلز کی شامت آگئی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر تماشہ! بسوں کے ٹائر پھاڑے جا رہے ہیں بسیں جلائی جا رہی ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ قریباً ساٹھ ستر آدمیوں کو ہم نے بس سے اتار کر کھڑا کر دیا اور بس کو آگ لگا دی تو وہ لوگ ہم کو دل میں گالیاں نہیں دے رہے ہوں گے اور اس طرح رائے عامہ ہمارے حق میں جا رہی ہے یا خلاف جا رہی ہے۔ اب آپ سوچئے کہ اگر کسی کو چار پانچ میل دور اپنے کسی مقام پر جانا ہے تو اس پر کیا بیتی ہو گی۔ پھر ایسی حرکتوں سے وقت کے برسرِ اقتدار طبقہ کو کیا تکلیف پہنچتی ہے۔ اور اس کا کیا نقصان ہوتا ہے! تکلیف پہنچتی ہے عوام الناس کو اور نقصان ہوتا ہے قومی املاک کا ___ اس کا نام مظاہرہ نہیں ہے۔ یہ تو

---

[1] محترم ڈاکٹر صاحب نے یہ تقریر کئی ماہ پہلے مسجد دارالسلام میں ارشاد فرمائی تھی۔ حال ہی میں "نوائے وقت" کے ممتاز کالم نگار جناب م۔ش صاحب کا ایک خط ڈاکٹر صاحب کو موصول ہوا ہے جس میں فاضل کالم نگار نے یہ انکشاف کیا ہے کہ خان عبدالغفار خان نے ایک بار انہیں (یعنی م ش صاحب کو) یہ بتایا کہ گاندھی نے عدم تشدد کا فلسفہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے اخذ کیا ہے۔ (مرتّب)

درحقیقت فساد ہے، ہنگامہ ہے۔ اس کا کوئی حاصل نہیں ہے۔ نتیجہ خیز مظاہرہ وہ تھا جس کی میں نے ابھی سکھوں کی مثال دی ہے ـــــ اپنے حقوق کے لئے، اپنے جائز مطالبوں کے لئے کسی مستبد اور جابر برسراقتدار طبقے کے خلاف سڑکوں پر نکلنا پڑے تو نکلئے لیکن اس شان سے کہ لاٹھی چارج سے سر پھٹ جائے، گولیوں کی بوچھاڑ سے جسم زخمی ہو جائے آنسو گیس سے آنکھوں میں شدید اذیت پہنچے لیکن ہاتھ بندھے رہیں اور کسی نوع کا Retaliation نہ ہو۔ یعنی جواب میں کسی نوع کا بھی متشددانہ رویہ اختیار نہ کیا جائے رہا توڑ پھوڑ، بسوں، موٹر سائیکلوں، موٹروں اور قومی املاک کو نقصان پہنچانا تو جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ فساد ہے، بدامنی ہے جو حکومتِ وقت کو پوری قوت کے ساتھ تحریک کو کچلنے اور ختم کرنے کا اخلاقی اور قانونی دونوں جواز فراہم کرتی ہے ـــ میں پھر عرض کرتا ہوں کہ میں دوسروں کی مثالیں اگر دیتا ہوں تو صرف اس اعتبار سے کہ میرا حقیقتاً علامہ اقبال مرحوم کے ان اشعار پر پورا یقین ہے کہ ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو   آنکہ از خاکش بروید آرزو!
یا زِ نورِ مصطفےٰ او را بہاست   یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است

دنیا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سعید و مبارک دور سے ہی بہت کچھ سیکھا ہے یا ابھی نوعِ انسانی نورِ مصطفیٰ کی تلاش میں ہے۔ یعنی بغیر جانے بوجھے اور غیر شعوری طور پر ان راستوں کی تلاش میں ہے اور اسی کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے جو راستے محمدؐ رسول اللہ نے دیئے تھے۔ یہ یقین ہے جس کی وجہ سے میں دوسروں کی مثالیں دیا کرتا ہوں۔

بہرحال میرا ارادہ تھا کہ Resistance کے تینوں پہلو آج ہی مکمل کر دوں لیکن بات کچھ طویل ہو گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ سیرت کے وہ پہلو ہیں جو اس طور پر ہمارے سامنے نہیں ہیں اس لئے ان پر بات کچھ تفصیلاً بیان کرنی پڑ جاتی ہے ـــ بقیہ جو دو مراحل نسبتاً مختصر ہیں ان شاء اللہ ان کے بارے میں اگلے جمعہ میں گفتگو ہوگی۔ البتہ یہ بات یاد رکھئے اور میں نے شروع ہی میں اسے نوٹ کرا دیا تھا کہ یہ سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی ابھی Objective Study ہے۔ اس کے بعد دو اعتبارات سے فرق واقع ہونا لازمی ہے۔ ایک تو تمدنی و عمرانی ارتقاء کی وجہ سے چودہ صدیوں میں جو فصل ہے اس کے باعث جو فرق واقع ہوا ہے اس کو سامنے رکھنا ہوگا۔

اور ہمیں غور کرنا ہوگا کہ فلسفۂ انقلاب کے اس Phase کو ہم جوں کا توں Adopt (اختیار) کریں یا اس میں ہمیں سیرتِ مطہرہ ہی کے واقعات و حالات سے اصول لے کر استنباط کے ذریعہ سے تھوڑا بہت فرق کرنا پڑے گا۔ دوسرے یہ کہ وہاں حضورؐ کا مقابلہ تھا، غیر مسلموں سے، مشرکوں سے اور کافروں سے۔ اور اب جہاں کہیں بھی اسلامی انقلاب کی بات ہوگی تو ظاہر ہے کہ کسی مسلمان ملک میں ہوگی۔ اس انقلاب کا راستہ روکنے والے بہرحال مسلمان ہی ہوں گے۔ چاہے وہ محض نام ہی کے ہوں۔ قانوناً تو وہ مسلمان ہی قرار پائیں گے، اس اعتبار سے بھی اجتہاد کی ضرورت ہوگی۔ ان پہلوؤں پر ان شاء اللہ اگلے جمعوں سے ترتیب وار گفتگو ہوگی۔ ایک بات یہ بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ میں اسلامی انقلاب کے جو مراحل، مدارج اور لوازم تقاریر کے ذریعے بیان کر رہا ہوں اور ہر تقریر میں ایک ہفتہ کا وقفہ حائل ہوتا ہے۔ اس لئے خواہی نخواہی بعض باتوں کا اعادہ اور تکرار ہو جاتی ہے جو اس صورت میں Avoid کرنی میرے لئے مشکل ہوتی ہے۔ توقع ہے کہ میری اس مشکل اور دقت کے پیشِ نظر آپ مجھے رعایت (Allowance) دیں گے۔

اقول قولی ھٰذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

نبی اکرمؐ کی اصل جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کو
کوئی نہیں جان سکتا، مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ
"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"
ہمارے لیے اصل قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ:
کیا ہم آپؐ کے دامن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں؟
اس لیے کہ اسی پر ہماری نجات کا دار و مدار ہے
اس اہم موضوع پر
ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے
ہمارے تعلق کی بنیادیں
کا خود بھی مطالعہ کیجئے اور اس کو پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجئے
ہدیہ فی نسخہ: تین روپے۔ جمعی تقسیم کیلئے یکصد نسخوں پر ۳۳ فی صد کمیشن دیا جائے گا:

بعثتِ انبیاء و رسل کا اساسی مقصد ___ اور
بعثتِ محمدیؐ کی تامی و تکمیلی شان ___ نیز
انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج ___
ایسے اہم موضوعات پر
ڈاکٹر اسرار احمد
کی
حد درجہ جامع تصنیف
نبی اکرمؐ کا مقصدِ بعثت
کا مطالعہ کیجیے
اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ طباعت ○ قیمت فی نسخہ ۳ روپے
مرکزی انجمن خدام القرآن ○ ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

منکرینِ سنت کے
عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی پر
اعتراضات کا مسکت و مدلل جواب

# "عید الاضحیٰ"
— اور —
# "فلسفہ قربانی"

کتاب میں ملاحظہ فرمائیے جو
ڈاکٹر اسرار احمد
کی ایک تقریر اور ایک تحریر پر مشتمل ہے۔
آفسٹ سفید کاغذ۔ عمدہ طباعت۔ صفحات ۴۸
قیمت چار روپے صرف
تنظیم اسلامی کے مقامی تمام مکتبوں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔
— ناشر —
مرکزی انجمن خدام القرآن ۔ لاہور!

# ایگل
ایک
عالمگیر
قلم!

ہر
جگہ
دستیاب
ہے

A PRODUCT OF
AZAD FRIENDS & CO. LTD.

AFC-8/74 Crescent

# امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد
# انٹرویو کے آئینے میں

## امیرِ تنظیم سے ہفت روزہ "چٹان" کے نمائندے محمد آصف بھلّی کا مفصل انٹرویو

س : ڈاکٹر صاحب! کیا آپ ہمیں اپنی ابتدائی زندگی تربیت اور بچپن کی معصوم خواہشوں کے بارے میں کچھ بتانا پسند فرمائیں گے؟

ج : میری پیدائش مشرقی پنجاب کے قصبے حصار میں ہوئی، ۲۶ اپریل ۱۹۳۲ء کو۔ اب بھارت کی ریاست ہریانہ میں یہ ریاست شامل ہے جس زمانے میں ہم اسے چھوڑ کر آئے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں۔ تو اس کی آبادی تیس ہزار تھی۔ اب وہ تین لاکھ کو پہنچ چکی ہے۔ اور اس وقت وہاں کالج کوئی نہیں تھا۔ اب یونیورسٹی ہے۔ ہمارے فیصل آباد کی زرعی یونیورسٹی کی سطح کی وہاں زرعی یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے۔ اصل میں میرے والدین کا تعلق مغربی یوپی کے ضلع مظفر نگر سے ہے۔ قصبہ بنت سے میری والدہ کا تعلق ہے اور حسین پور سے والد صاحب کا لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں میرے پردادا پر انگریزی حکومت کی جانب سے کچھ عتاب نازل ہوا تھا۔ جس کی بنا پر ان کو وہاں سے نقلِ مکانی کرنی پڑی اور یہاں مشرقی پنجاب میں منتقل ہونا پڑا۔ میرے ذہن پر سب سے بنیادی اور زیادہ گہرا اثر علامہ اقبال کی ملّی شاعری کا ہوا۔ علامہ اقبال کی شاعری میں جو امید افزا پیغام ہے کہ ؂

کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہو گی
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

؂ نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

تو اس طرح کے اشعار کا میرے ذہن پر بڑا گہرا اثر مرتب ہوا اور اس سے ایک جذبہ پیدا ہوا۔

اسی زمانہ میں حفیظ جالندھری کا شاہ نامۂ اسلام بھی اسی جذبے کے ساتھ پڑھا جس طرح کہ کلامِ اقبال کو پڑھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک رات ایسی بھی گزری کہ ہمارے والد صاحب کسی سرکاری کام کے لئے دورے پر تھے۔ تو میں نے پوری رات شاہنامہ ترنم کے ساتھ پڑھا اور والدہ نے سنا۔

اس زمانے میں مجھے مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کا بھی شوق ہوا۔ ایک ہوتے تھے ماسٹر غلام محمد بھٹی۔ حصار میں ایک انڈسٹریل سکول تھا۔ اس کے وہ استاد تھے۔ ان کا بھی شوق تھا کتابوں کا۔ بڑی عمدہ کتابیں ہوتی تھیں ان کے پاس۔ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی کتابیں ان سے لینے گیا تو انہوں نے پس و پیش سے کام لیا۔ بالآخر انہوں نے یہ کیا کہ کتاب کھولی اور فارسی کے کچھ اشعار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کا مطلب بتا دو اور کتاب لے جاؤ۔ میں نے کبھی فارسی نہیں پڑھی تھی۔ لیکن یہ کہ کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا ہوا کہ میں نے ان کا مفہوم جو اندازے سے بیان کیا وہ درست نکلا اور انہوں نے مجھے کتاب دے دی۔

میرا جو ہائی سکول کا دور ہے وہ ہے تحریکِ مسلم لیگ کے عروج کا زمانہ۔ اس وقت جو ایک جذبہ مسلم قومیت کا، حصولِ پاکستان کا پورے برِصغیر کے مسلمانوں میں سرایت کر گیا تھا اس کا رسدی حصہ ہم بچوں تک بھی پہنچ رہا تھا تو میں اس زمانے میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں انتہائی جوش و خروش کے ساتھ حصہ لے رہا تھا۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ضلع حصار میں صرف ایک مقام پر ہندوؤں کا کالج تھا۔ حصار شہر میں تو صرف سکول ہی تھے۔ باقی ضلع میں بھی مسلمانوں کے تعلیمی ادارے سکولوں ہی کے درجے پر تھے۔ ظاہر بات ہے کہ ہماری فیڈریشن سکولوں کے طلبہ ہی پر مشتمل تھی اور اس کے عہدیدار بھی ہائی سکول کے طلبہ ہی تھے۔ میں ضلع حصار کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا جنرل سیکرٹری بھی رہا ہوں اور اسی حیثیت میں میں نے ۴۶ء میں یہاں لاہور میں ایک کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ اس کانفرنس سے قائداعظم نے بھی خطاب کیا تھا۔

اس زمانے میں میرا تعارف مولانا مودودی اور ان کی جماعت یعنی جماعتِ اسلامی سے ہو چکا تھا۔ ان کے ابتدائی پمفلٹ میں نے شوق کے ساتھ پڑھے۔ میرے بڑے بھائی اظہار احمد قریشی ان دنوں بڑے استیعاب کے ساتھ مولانا مودودی کی تحریروں کا مطالعہ کر رہے تھے۔ تو مجھے بھی دلچسپی ہوئی۔ حصار میں جماعتِ اسلامی کے کارکنوں مرزا مسرت بیگ، چوہدری نذیر احمد کے یہاں میرا آنا جانا تھا۔ ان دونوں حضرات کا ملتان میں انتقال ہوا ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ جب فیڈریشن کے حلقوں میں مولانا مودودی اور ان کی تحریروں پر تنقیدیں ہوتی تھیں تو میں مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کی مدافعت میں گفتگو کرتا تھا۔ البتہ جماعت کے لوگوں کے ساتھ میں مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کے حق میں گفتگو کرتا تھا۔ تو یہ میرا ایک بین بین سا معاملہ تھا کہ عملی تعلق میرا تحریکِ پاکستان اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن سے تھا لیکن یہ کہ ذہنی اور قلبی دلچسپی مولانا مودودی اور

ان کی تحریروں سے تھی۔ یہ بھی میں آپ سے عرض کر دوں کہ میں نے چھٹی جماعت ہی سے عربی کا مضمون لے لیا تھا اور سکول کے ذہین طلباء میں میرا شمار ہوتا تھا اگرچہ میں نے کبھی لکھنے پڑھنے میں محنت نہیں کی۔ اس وقت ترجمان القرآن میں تفہیم القرآن شائع ہو رہی تھی ہم اس کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اس سے قرآنِ حکیم کی جانب ایک خصوصی رغبت اور لگاؤ پیدا ہوا۔ اس دور کے دلچسپ واقعات کے حوالے ایک یہ بات بھی عرض کر دوں کہ الطاف حسن قریشی جو اردو ڈائجسٹ کے مدیر ہیں وہ رشتے میں میرے چچا لگتے ہیں یہ ہوتے تھے سرسہ میں۔ جب کہ ہمارا زیادہ وقت گزرا ہے حصار میں۔ میٹرک کے امتحان کی تیاری کے لئے وہ میرے پاس آ گئے کہ مل جل کر مطالعہ کریں گے لیکن اس زمانے میں مجھ پہ دوسری قسم کی دلچسپیوں کا کچھ زیادہ غلبہ تھا۔ سیر بلکہ آج کی اصطلاح میں آوارگی کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ ہوتا یہ تھا کہ میں انہیں پڑھنے کے لئے بٹھا دیتا تھا اور خود نکل جاتا تھا۔ والدین یہ سمجھ رہے ہوتے تھے کہ دونوں پڑھ رہے ہیں۔ تو اس سے مجھے ایک طرح کی ڈھال میسر آ گئی تھی اس سیر وغیرہ کے لئے۔

تقسیم کے بعد ہم کرشن نگر لاہور میں رہنے لگے۔ یہاں آ کر میں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا تو ایف ایس سی میں نے گورنمنٹ کالج سے کیا۔ اس کے بعد میں میڈیکل کالج میں آ گیا۔ میرا جو تعلیمی کیریئر رہا ہے اس کے بارے میں بھی عرض کر دوں کہ میں نے پرائمری میں وظیفہ لیا تھا۔ آٹھویں جماعت میں بھی۔ دسویں جماعت میں پورے پنجاب یعنی متحدہ پنجاب میں مسلمان امیدواروں میں چوتھے نمبر پر آیا ساڑھے آٹھ سو میں سے میرے سات سو اٹھارہ نمبر تھے۔ اس کے بعد میں یہاں آ گیا۔ ایف ایس سی میں بھی میری فورتھ پوزیشن تھی۔ چنانچہ میں بڑی آسانی سے میڈیکل کالج میں داخل ہو گیا۔ پانچ سال بھر میں نے میڈیکل کالج میں لگائے اور ۱۹۵۴ء میں ایم بی بی ایس کر کے فارغ ہوا۔

پاکستان آتے ہی اب وہ جو مسلم لیگ کی تحریک کا منطقی نتیجہ ہونا چاہئے تھا یعنی یہ کہ یہاں اسلام نافذ ہونا چاہئے تھا اب اس کی علمبردار بن کر جماعتِ اسلامی سامنے آئی۔ مطالبے کئے۔ مہم چلائی کہ اسلامی دستور بننا چاہئے۔ تو میرا پہلے سے بھی ایک تعارف اور ذہنی قرب جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کی تحریروں سے ہو چکا تھا۔ لہٰذا میں نے فوراً تحریکِ اسلامی میں شمولیت اختیار کی۔ دو سال کے دوران میں جب میں گورنمنٹ کالج میں زیرِ تعلیم تھا اس وقت کرشن نگر میں جماعتِ اسلامی کا ایک حلقۂ ہمدردان تھا میں اس میں کام کرتا رہا۔ اس کے بعد جب میڈیکل کالج میں آ گیا تو میں نے اسلامی جمعیتِ طلبہ میں شمولیت اختیار کر لی اور اس میں میں نے بہت بھرپور حصہ لیا۔ ۱۹۵۱ء میں لاہور اور پنجاب کی جمعیت کا ناظم مقرر ہوا ۱۹۵۲ء میں سالانہ اجتماع میں میرا انتخاب ہوا ناظمِ اعلیٰ کی حیثیت سے۔ ۱۹۵۴ء میں میں نے ایم بی بی ایس

پاس کرلیا۔ اس عرصے میں خاص طور پر مجھے وہ دلچسپی جو قرآن حکیم کے ساتھ میرے ہائی سکول کے ایام سے ہوگئی تھی اس میں مولانا مودودی کی تصنیفات سے مزید اضافہ ہوا۔ اس زمانے میں جمعیت کے اجتماعات میں درسِ قرآن کی ذمہ داری اکثر وبیشتر مجھ پر ہوتی تھی۔ عام طور پر میرا درس پسند کیا جاتا تھا میں اس کے لئے محنت کرتا تھا۔ مطالعہ کرتا تھا۔ اس کے علاوہ تقریری صلاحیتیں بھی اس دور میں پروان چڑھیں۔ اس کے علاوہ کچھ لکھنے کا بھی شغف پیدا ہوا۔ کیونکہ اس زمانے میں ہم ایک رسالہ عزم نکالا کرتے تھے جس کی ادارت بھی میرے ذمے تھی۔ ان ساری چیزوں کا ابتدائی تجربہ مجھے جمعیت میں ہوا اور میں سمجھتا ہوں کہ میری آئندہ زندگی کی تعمیر میں اس دور کا یقیناً بہت زیادہ حصّہ ہے۔

س : ڈاکٹر صاحب! آپ کی گفتگو سے ایک بڑی دلچسپ صورتِ حال سامنے آئی کہ آپ تحریکِ پاکستان کے حوالے سے مسلم لیگ کے ساتھ بھی وابستہ رہے اور آپ کا ذہنی اور قلبی رشتہ جماعتِ اسلامی سے بھی استوار رہا جو بہرحال اس وقت تحریکِ پاکستان کی ایک مخالف جماعت کا کردار ادا کر رہی تھی تو کیا یہ ایک طرح کا فکری تضاد نہیں۔ آپ بیک وقت اپنی ان دونوں وابستگیوں کا کیا جواز پیش کریں گے!

ج : میرے نزدیک تو اس میں کوئی نظریاتی بُعد نہیں ہے۔ جہاں تک تقسیم سے پہلے دَور کا تعلق ہے میری عملی وابستگی پوری کی پوری تحریکِ پاکستان کے ساتھ تھی۔ البتہ یہ کہ دینی تحریروں کے حوالے سے مجھے جماعتِ اسلامی پسند تھی۔ باقی میں یہ بتا چکا ہوں کہ جب کوئی بحث ہوتی تھی تو میں مسلم لیگیوں سے گفتگو کرتے ہوئے جماعتِ اسلامی کی مدافعت کرتا تھا اور جماعتِ اسلامی والوں سے گفتگو کرتے ہوئے تحریکِ پاکستان کے حق میں دلائل دیتا تھا۔ البتہ قیامِ پاکستان کے بعد تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ مسلم لیگ کا جو موقف تھا جماعتِ اسلامی نے اسی کو اختیار کیا ہے تو اس اعتبار سے تضاد کا سوال ہی نہیں۔ البتہ یہ احساس مجھے بعد میں ہوا کہ جماعتِ اسلامی کا جو اصل موقف تھا انہوں نے اس کو چھوڑ کر یہ نیا موقف اختیار کر لیا ہے اس اعتبار سے میری لائن تو سیدھی ہے لیکن جماعتِ اسلامی کی لائن سیدھی نہیں ہے۔ لیکن اس کا پہلے مجھے اتنا شعور نہیں تھا۔ ظاہر بات ہے کہ ایک ہائی سکول کا طالب علم یا ایف ایس سی کا طالب علم اتنی باریک بینیوں میں نہیں جا سکتا۔

س : اچھا ڈاکٹر صاحب! میں تاریخ کے اس مغالطے کو بھی آپ کی زبان کے ذریعے دور کرانا چاہتا ہوں کہ کچھ جماعتیں تھیں جو تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں تھیں۔ کچھ جماعتیں اپنے اس اختلاف کو تسلیم بھی کرتی ہیں۔ لیکن جماعتِ اسلامی ایک ایسی تنظیم ہے جو اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ تحریکِ پاکستان کے دَور میں وہ مسلم لیگ اور اس کے مطالبۂ پاکستان کے خلاف رہی ہے۔ تو آپ اس بات کی وضاحت فرما دیجئے کہ تحریکِ پاکستان

کے حوالے سے قیام پاکستان سے پہلے جماعتِ اسلامی کا اصل موقف کیا تھا اور بعد ازاں اس میں کیا تبدیلی آئی ـــــ؟

ج : اس موضوع پر میری تو بڑی مفصل تحریریں موجود ہیں لیکن اس وقت آپ اختصار کے ساتھ جو چیز چاہتے ہیں تو میں عرض کروں گا کہ اس میں دو چیزوں کو الگ الگ سمجھنا چاہیئے۔ ایک ہے مولانا مودودی کا رول ایک فرد کی حیثیت سے ۔ جماعتِ اسلامی کے قیام سے قبل ۔ ایک وہ دور ہے کہ جب جماعتِ اسلامی قائم ہو جاتی ہے تو اس کے پلیٹ فارم سے مولانا مودودی کا کردار۔ ان دونوں میں کچھ فرق کیا جانا چاہیئے ۔ مولانا مودودی نے جب اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا ہے تو اس میں ابتداءً انہوں نے بڑی سخت تنقیدیں کی تھیں جمعیت علماء ہند کے موقف پر اور متحدہ قومیت کے تصوّر کے خلاف بہت زوردار تحریریں انہوں نے سپردِ قلم کی تھیں. اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ برِّصغیر میں مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کے شعور کو ابھارنے میں ان کا بھی حصّہ ہے ۔ کانگریس اور جمعیت علماءِ ہند کا جو موقف تھا اس کی مخالفت میں انہوں نے فعال کردار ادا کیا ہے ۔ البتّہ یہ کہ پھر انہوں نے خود اپنے موقف میں ایک تبدیلی پیدا کی اور اس تبدیلی کو وہ خود تسلیم کرتے ہیں ۔ وہ تبدیلی آئی ہے ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء میں کہ انہوں نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ مسلم قوم پرستی ہندوستان میں اب جو رنگ اختیار کر رہی ہے وہ اسلام کے مزاج کے خلاف ہے کہ قوم پرستی ہی قوم پرستی اس کے اندر اب بڑھتی چلی جا رہی ہے اور اسلام کا عنصر اس میں کم ہوتا چلا جا رہا ہے ۔ اس حوالے سے انہوں نے مسلم لیگ اور قائد تحریکِ پاکستان کی قیادت پر تنقید شروع کر دی ۔ یہاں سے ان کا تحریکِ پاکستان سے نہ صرف علیحدگی کا معاملہ شروع ہو گیا ۔ بلکہ مخالفت کا دور شروع ہو گیا ۔ اب یہی زمانہ ہے ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک جو مسلم لیگ کی تحریک کا اصل دَور ہے ۔ اس پورے دَور میں جماعتِ اسلامی نے مسلم لیگ کی اور تحریکِ پاکستان کی ڈٹ کر مخالفت کی اور اس میں بعد میں انہوں نے جو تاویلیں کی ہیں وہ کسی طرح بھی درست نہیں ہیں. وہ سب خلافِ واقعہ ہیں ۔ اور اس پر مجھے افسوس ہوتا ہے کہ تاریخی حقائق کو بھی توڑنے مروڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالانکہ ان کی تحریریں موجود ہیں اور کسی فرد یا جماعت کو اس طرح اپنے ماضی سے انحراف نہیں کرنا چاہیئے۔ اس سے وقتی طور پر تو شاید کچھ فائدے حاصل ہو جائیں لیکن انجام کار کے طور پر یہ تحریکوں کے لئے سودمند نہیں ہوتا بلکہ نقصان دہ ہوتا ہے ۔ میرے نزدیک ۱۹۴۷ء کے اواخر (یعنی پاکستان آنے کے بعد) پھر ایک دوسرا رخ اختیار کیا مولانا مودودی نے ۔ وہ اپنے اصولی انقلابی موقف کو چھوڑ کر جو ۱۹۴۰ء سے لے کر ۱۹۴۷ء کے اواخر تک ان کا رہا ۔ اور جس پر کہ جماعتِ اسلامی کاربند رہی پاکستان میں انہوں نے مسلم قومی سیاسی جماعت کا کردار اپنایا ۔

س : آج جماعتِ اسلامی کا سارا زور اس بات پر صرف ہوتا ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر معرض وجود میں آیا تھا۔ اس کے مقابلے میں سردار شوکت حیات اور ممتاز دولتانہ وغیرہ کہتے ہیں کہ پاکستان اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے قائم نہیں ہوا تھا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جماعتِ اسلامی جو ایک تسلسل کے ساتھ اس بات کو دہرا رہی ہے کہ پاکستان اسلام اور صرف اسلام کے لئے قائم ہوا تھا۔ تو پھر آخر کس بنیاد پر جماعتِ اسلامی نے قیامِ پاکستان کی مخالفت کی تھی؟

ج : اس معاملے میں دو طریق ہو سکتے ہیں میرے جواب کے۔ ایک تو یہ کہ جماعتِ اسلامی والوں کا جو اس وقت موقف تھا میں اس کو بیان کر دوں۔ ایک یہ کہ میں خود اپنی رائے دوں۔ مولانا مودودی کا جو موقف رہا ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ اصولاً درست تھا۔ وہ یہ تھا کہ صرف قومی جدوجہد کے ذریعے سے ایک ملک کو حاصل کر لینے سے اس میں اسلام کو بالفعل قائم کرنے کا نتیجہ از خود برآمد نہیں ہوتا۔ ایک سیکولر اور مسلم قومی ریاست تو وجود میں آ سکتی ہے لیکن ایک اسلامی ریاست وجود میں نہیں آ سکتی۔ مولانا مودودی کا کہنا یہ تھا کہ ہم محض مسلم قوم نہیں بلکہ ہمیں اسلام کے لئے کام کرنا چاہیئے تو اسلامی انقلاب برپا کرنے کا طریق تو یہی ہے کہ پہلے صحیح صحیح اسلام کی دعوت دی جائے پھر جو لوگ اسے ذہناً قلباً اور شعوری طور پر قبول کریں ان کو منظم کیا جائے۔ اور پھر انہیں خود اسلام پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔ پھر یہ تحریک جب ایک قوت بن کر ابھرے اور یہ لوگ اپنی دعوت میں توسیع کرتے ہوئے ایک انقلاب کی طرف پیش قدمی کریں تو اس کو میں سمجھتا ہوں کہ ایک اصولی اسلامی انقلابی لائحۂ عمل۔ میرے نزدیک جماعتِ اسلامی کا وہ دور ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت کا دور ہے۔ اس اعتبار سے میں ان کے موقف کو درست سمجھتا ہوں۔ البتہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس وقت جماعت کی طرف سے جو شدت پسندی کا مظاہرہ کیا گیا جس شدت کے ساتھ انہوں نے مسلم لیگ کی تحریک کی نفی کی وہ انہیں نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ اس لئے کہ اصل صورتِ حال یہ تھی کہ چاہے اسلام ہم مسلمانوں میں اتنا زیادہ نہیں رہا تھا لیکن ہم لوگ مسلمان تو تھے۔ اور جو شخص بھی مسلمان ہے اس کے کچھ حقوق ہیں۔ اس اعتبار سے مسلمانوں کی جو جدوجہد ان کے قومی تشخص کے تحفظ کے لئے چل رہی تھی اس میں چاہے جماعتِ اسلامی شرکت نہ کرتی کہ ہمارا لائحۂ عمل تو اس سے مختلف ہے لیکن اس کی مذمت کرنا کسی طرح درست نہ تھا۔ اس سے تقویت تحریکِ پاکستان کی مخالف قوتوں کو حاصل ہوئی تھی تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں کچھ جذباتیت اور شدت پسندی کو دخل تھا اختلافات بجا سہی مگر اس طرح کہ مسلم قوم پرستی کی تحریک کو ایک کفر اور شرک قرار دے دینا کسی طرح بھی درست نہ تھا۔ میرے اپنے نزدیک بات یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی نے جس طرح تحریکِ پاکستان سے پہلے ایک اصولی اسلامی جماعت کی طرح کام کیا تھا اسی نہج پر ان کو اپنا کام آگے بڑھانا چاہیئے تھا اور پاکستان میں اسلامی

انقلاب برپا کرنے کے لئے اپنی جدوجہد کرتے رہنا چاہئے تھا۔ بدقسمتی سے یہاں آکر جماعت اسلامی نے بالکل دوسرا رخ اختیار کر لیا۔ یہاں آکر اس نے ایک سیاسی جماعت کا روپ دھار لیا۔

رہا یہ معاملہ کہ آیا تحریک پاکستان اسلام کے لئے تھی یا نہیں تھی تو اس میں میں سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں بہت سا کنفیوژن ہمارے ہاں موجود ہے۔ جہاں تک تحریک پاکستان کے اس نعرہ کا تعلق ہے تو یہ محراب سے بھی اور منبر سے بھی ہے۔ سیاسی جماعتوں کے پلیٹ فارموں سے بھی ہے حکومت سے بھی ہے۔ اپوزیشن سے بھی ہے کہ پاکستان کا مطلب کیا: لا الٰہ الا اللہ۔ (اس سے انکار ممکن نہیں)۔ بہرحال اختلافی آراء سامنے آتی رہتی ہیں حسین شہید سہروردی کی یہ رائے تھی کہ تحریک پاکستان خالص معاشی معاملہ تھا۔ جناب نورالامین نے بھی اسی طرح کی بات کی۔ اب آکر دولتانہ صاحب نے فرمادیا کہ پاکستان کی تحریک خالص سیاسی مہم تھی اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسی طرح شوکت حیات نے بھی کہا کہ پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ ۔ تو یہ نعرہ بھی چند چھوکروں نے ایجاد کیا تھا۔ میرے نزدیک دونوں طرف جزوی حقیقت موجود ہے۔ اصل صورتِ حال جو میں سمجھتا ہوں کہ وہ یہ ہے کہ اس پرابلم کے تین لیول تھے اور ہر لیول کے حساب سے جواب بدل جاتا ہے۔ مثلاً میں پانی کی مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک تو زمین کی سطح پر ہے جو نظر آرہا ہے۔ ایک کچھ نیچے ساٹھ ستر فٹ پر ہے۔ جسے ہم کنواں بنا کر نکالتے ہیں۔ پھر یہ کہ بہت گہرائی میں آپ جائیں تو تین چار سو فٹ نیچے بھی پانی ہے۔ اسی طرح سے اس مسئلے کے بھی تین لیول ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے تو میرے نزدیک یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے انکار کرنے والا نہایت ڈھیٹ شخص ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ نعرہ نہ ہوتا چاہے وہ چھوکروں کی ایجاد تھا تو برِّصغیر کے تمام مسلمان اس جوش و جذبے سے کبھی مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع نہ ہوتے قائداعظم کی تقریروں اور بیانات سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلم لیگ کو اگر مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بننے کا اعزاز حاصل ہوا تو اسی نعرے کی بدولت تھا کوئی اور بات مسلمانوں کو ایک پرچم تلے جمع نہیں کر سکتی تھی۔ تو پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر پوچھا جائے کہ کیا پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے تو اس کا جواب اثبات میں ہے۔ لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ اصل محرّک کیا تھا تحریک پاکستان کا تو اس کے بارے میں میں سمجھتا ہوں کہ اختلاف کی گنجائش ہے۔ کوئی شخص اگر یہ کہتا ہے کہ معاشی مسئلہ تھا تو میں اسے بھی یکسر غلط نہیں سمجھتا۔ کوئی شخص اگر یہ کہتا ہے کہ زبان کا یا سماجی مسئلہ تھا تو میں اسے بھی غلط نہیں سمجھتا۔ کوئی شخص اگر یہ کہے کہ تحریک پاکستان کی اصل بنیاد سیاسی تھی تو میں اسے بھی بالکل غلط نہیں کہوں گا لیکن میرا اپنا جواب یہ ہوگا کہ تینوں باتوں میں جزوی سچائی ہے۔ ان سچائیوں کو اگر ایک بات میں جمع کریں تو یہ قومی

مسئلہ تھا۔ ایک قومی جذبہ تھا اور یہ قومی جذبہ بھی چاہے اسے منفی جذبہ کہا جائے میرے نزدیک یہ خوف کا جذبہ تھا کہ چھوٹی قوم کو بڑی قوم سے اندیشہ لاحق ہو گیا تھا۔ چھوٹی قوم نے ایک ہزار برس تک حکومت کی تھی اور وہ محسوس کرتی تھی کہ اس حوالے سے بڑی قوم میں انتقامی جذبات ہیں اور کچھ حالات بھی اس طرح کے پیدا ہو گئے تھے کہ انگریزوں کے دور میں بڑی قوم ابھر کر سامنے آگئی تھی اور وہ ایک بیدار قوم کی حیثیت سے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ سرمایہ اس کے پاس تھا، تعلیم اس کے پاس تھی۔ چھوٹی قوم عددی اعتبار سے بھی کم تھی اور تعلیم، سرمایہ اور تنظیم غرض کہ ہر اعتبار سے وہ بہت پیچھے تھی۔ لہٰذا اس چھوٹی قوم کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ بڑی قوم اس کو ایکسپلائٹ کرے گی۔ معاشی اعتبار سے سیاسی اعتبار سے بھی اور سماجی اور مذہبی اعتبار سے بھی۔ شدھی اور سنگھٹن جیسی تحریکیں چلائی جائیں گی۔ لہٰذا اگر کوئی مجھ سے کوئی پوچھے کہ تحریک پاکستان کا اصل جذبۂ محرکہ کیا تھا تو میرے نزدیک وہ ایک قومی جذبہ تھا، ایک چھوٹی قوم کا کہ بڑی قوم اس کو ساتھ لے کر نہیں چلے گی بلکہ اس کے ساتھ ظلم اور زیادتی روا رکھی جائے گی۔ لیکن اب اس سے بھی نیچے آئیے وہ سب سے صاف اور شفاف پانی کا لیول ہے۔ تو وہاں جب آئیں گے تو اب سوال یہ ہو گا کہ اس چھوٹی قوم کی جس کو یہ اندیشہ تھا اس کی اساس کیا تھی تو اس کا جواب صرف یہی ہو گا کہ وہ تو صرف اسلام ہی تھا تو ہم اسی نتیجے پر پہنچے کہ پاکستان کی بنیاد اسلام پر ہی استوار ہوئی تھی۔

س : اچھا ڈاکٹر صاحب! یہ فرمائیں جماعتِ اسلامی کے ساتھ تعارف اس کے ساتھ وابستگی اور پھر اس سے علیحدگی کے اسباب کیا تھے۔ آپ نے کن مقاصد کے لئے جماعتِ اسلامی میں شمولیت اختیار کی تھی اور پھر اس سے علیحدگی کی وجہ آپ کا ان مقاصد سے انحراف ہے یا پھر جماعتِ اسلامی کسی اور راستے پر نکل گئی۔

ج : جماعتِ اسلامی سے میرا تعارف تو ہائی سکول کے ہی زمانے میں ہو گیا تھا پھر کالج کے زمانے میں اس سے عملی وابستگی اور پھر جمعیت طلبہ میں میری بھرپور جد و جہد کا جو دور رہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جماعتِ اسلامی سے عملی وابستگی میں چاہے میرے شعور کو دخل نہ ہو میں علامہ اقبال سے متاثر ہوا اور پھر تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اور جب قیام پاکستان کے بعد جماعت نے بھی ان ہی مقاصد کو اپنا لیا تو اس حوالے سے میں جماعت میں شامل ہو گیا۔ لیکن یہ مجھے پوری طرح اندازہ ہے کہ ۱۹۵۱ء میں ہی یعنی جب میرے دو سال ایف ایس سی کے اور دو سال میڈیکل کالج کے بیت چکے تھے میں نے اس تحریک کی جو اساس ہے اسے صحیح طور پر سمجھ کر شعوری طور پر قبول کیا۔ اور وہ شعوری احساس یہ ہے کہ اسلام کا تقاضا اپنے ماننے والوں سے یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ خود اسلام پہ کاربند ہوں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت میں ہمہ تن شریک ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کی دعوت دوسروں تک پہنچانا اور تیسری بات یہ

کہ اسلامی نظام کو عملاً نافذ کرنے کے لئے تن من دھن سے بھرپور جد و جہد کرنا تاکہ اسلام غالب ہو اور اللہ کا کلمہ بلند ہو۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسی جماعت میں شمولیت اختیار کی جائے جو ان مقاصد کے لئے قائم ہوئی ہو اور ان کے لئے پیش قدمی کر رہی ہو۔ یہ میرے نزدیک اس تحریک کی اصل اساس ہے۔ اور اس تحریک کو جب میں نے شعوری طور پر اختیار کیا۔ جمعیت میں رہا تو دراصل میں جماعت ہی کے ناطے سے اس میں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں کوشاں رہا۔ جیسے ہی میں نے ایم بی ایس پاس کیا تو جماعتِ اسلامی کا فوراً رکن بن گیا اور میں اس جماعت سے وابستگی کو اس درجے اہم سمجھتا تھا کہ جس روز میرا رزلٹ اناؤنس ہوا فائنل ایم بی بی ایس کا اسی روز میں نے جمعیت سے استعفیٰ لکھ دیا اور اسی روز جماعت کی رکنیت کے لئے درخواست تحریر کر دی۔ اس درخواست میں میں نے درج کر دیا کہ میں ایک رات بھی اپنے اوپر ایسی حالت نہیں آنے دینا چاہتا کہ میں کسی جماعت میں نہ ہوں۔ میرے نزدیک جماعت کی زندگی اقامتِ دین کے فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے لازمی ہے اب جماعت مجھے جب بھی رکن بنائے لیکن میں اپنے آپ کو جماعت ہی کے ڈسپلن کا پابند سمجھتا ہوں۔ میں بغیر جماعت کے زندگی بسر کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تو میرے احساسات کی یہ کیفیت تھی اس وقت — غالباً ۵ ار نومبر کو میں نے جماعت کی رکنیت کے لئے درخواست دے دی تھی اور فروری ۱۹۵۵ء میں میری یہ درخواست منظور کر لی گئی۔

تو پھر میرے سامنے جو دو سال آئے ان میں میرے نزدیک ایک بحران آیا۔ جماعتِ اسلامی میں فکری اعتبار سے — کچھ شواہد پہلے بھی موجود تھے۔ مثلاً ۱۹۵۱ء میں جماعتِ اسلامی نے انتخابات میں حصہ لیا تھا۔ امیدیں بڑی تھیں کہ ہم نے بڑا کام کیا تھا۔ لیکن جن امیدواروں کے ساتھ الیکشن میں حصہ لیا گیا تھا نتیجہ ان کے برعکس نکلا۔ ایک آدمی بھی اس پنچایتی نظام کے ذریعے سے منتخب نہ ہو سکا جو جماعتِ اسلامی نے اس وقت اختیار کیا تو اس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ ہمارے اندازے اور سوچ کچھ غلط ہے۔ ہم نے شاید اس معاشرے کی تشخیص صحیح نہیں کی ہے۔ یہ تو میں نہیں کہوں گا کہ اس وقت میں کسی نتیجے پر پہنچ گیا تھا۔ لیکن ایک سوال میرے ذہن میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس سوال کا جواب اس وقت میرے ذہن میں آیا جب ۵۳ء کی اینٹی قادیانی تحریک میں جماعتِ اسلامی کا جو رول تھا وہ سامنے آیا۔ وہ بڑا مبہم سا کردار تھا۔ تحریک کے ساتھ جماعتِ اسلامی تھی بھی اور نہیں بھی۔ پھر یہ کہ جماعتِ اسلامی نے اس سے پہلے قادیانیت کے خلاف تحریراً یا تقریراً کوئی بات نہیں کی تھی۔ معلوم ہوا کہ اس تحریک میں اُن کی شمولیت ایک مجبوری بن گئی تھی۔ چونکہ کچھ اور جماعتوں نے اس مسئلے کو اس وقت اتنا

اٹھایا تھا کہ اگر اس وقت اس میں حصّہ نہ لیتے تو شاید سیاسی موت واقع ہو جاتی ۔ تو میرا یہ خیال تھا کہ جماعتِ اسلامی شاید اصولاً اس تحریک میں حصّہ لینا درست خیال نہیں کرتی تھی ۔ ورنہ تو یہ کہ ان کے لٹریچر میں (پہلے سے) کچھ ہونا چاہیئے تھا ۔ کبھی تو انہوں نے یہ کہا ہو تا کہ یہ خطرہ ہے، یہ غلط ہے قادیانیت بہت بڑی گمراہی ہے ۔ بہت بڑا فتنہ ہے ۔ لیکن سرے سے اس مسئلے کو کبھی مودودی صاحب نے چھیڑا ہی نہیں تھا ۔ اب اچانک انہوں نے اگر اس تحریک میں حصّہ لینے کا فیصلہ کیا تو اس میں فیصلہ کن عنصر سیاست تھا ۔ تو اس طرح کے واقعات نے میرے ذہن میں کچھ سوال پیدا کر دیئے۔

پھر ۱۹۵۵ء میں جماعتِ اسلامی کے کارکنوں کا جو دینی اور اخلاقی معیار تھا وہ دیکھ کر مجھے شدید دھچکا لگا کہ جو کچھ سمجھ کر ہم جماعت میں آئے تھے وہ بالفعل تو موجود نہیں ہے ۔ مختلف اعتبارات سے جو معیار تھا وہ بہت ہی پست ہو چکا تھا ۔ ان تمام چیزوں کے بارے میں جب میں نے غور و فکر شروع کیا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جماعت اپنی اصل اساس جس پر یہ قائم ہوئی تھی اس سے انحراف کر چکی ہے اس کا لٹریچر کچھ اور کہتا ہے اور کارکن کچھ اور کام کر رہے ہیں ۔ اس اعتبار سے دونوں باتوں میں تضاد ہے ۔ یہ اسباب ہیں اس تحریک کی کمزوری کے ۔ تو میں چاہتا تھا کہ اس مسئلے پر میں اپنی رائے پیش کروں گا ۔ جو ہمارا سالانہ اجلاس کراچی میں ہو رہا تھا ۔ اور بھی بہت لوگ تھے جو اس نہج پر سوچ رہے تھے ۔۔۔ لیکن وہاں مولانا مودودی نے یہ حکمتِ عملی اختیار کی کہ اس اجتماع میں ان مسائل کو زیرِ بحث نہیں آنے دیا ۔ بلکہ جائزہ کمیٹی بنا دی کہ جائزہ کمیٹی پورے پاکستان کا دورہ کر کے جن لوگوں کو پالیسی سے اختلاف ہے ان کا نقطۂ نظر معلوم کر کے شوریٰ کو رپورٹ پیش کرے ۔

چنانچہ جب وہ جائزہ کمیٹی آئی اوکاڑے میں ۔ میں اس وقت وہاں کی جماعت کا امیر تھا تو میں نے جب ان کے سامنے اپنا نقطۂ نظر رکھا تو میں نے محسوس کیا کہ انہیں کچھ حیرانگی سی ہوئی میری باتیں ان کے دل کو لگیں اور جیسے وہ چونک سے گئے اور انہیں کچھ روشنی ۔ اس وقت میں نے کوئی تحریری صورت میں اپنا بیان نہیں دیا تھا بلکہ جب ہم کمرے کے باہر بیٹھے انتظار کر رہے تھے تو اس عرصہ میں میں نے کچھ پوائنٹ لکھ لیئے اور اندر جا کر جب میں نے زبانی گفتگو کی تو وہ چونکے اور مجھ سے کہنے لگے کہ آپ یہ باتیں لکھ نہیں سکتے ؟ میں نے کہا کہ میں کوشش کرتا ہوں اگر میں لکھ سکا تو پیش کر دوں گا ۔ چنانچہ میں نے پندرہ دن کے اندر اندر اپنا بیان تحریر کیا جو اب دو سو چھپن صفحات کی کتاب پر مشتمل ہے ۔ تو وہ حیران رہ گئے ۔ دس روز تو میں اپنا مطب بھی کرتا رہا اور وہ کتاب بھی لکھتا رہا ۔ اور پانچ روز میں ساہیوال سے لاہور چلا گیا ۔ اور اپنی ہمشیرہ کے گھر ایک کمرے میں معتکف ہو گیا اور اس کام کو مکمل کیا ۔ بہرحال

وہ رپورٹ میں نے ان کو دے دی۔

اس کے بعد جو رپورٹ بنی جائزہ کمیٹی کی جانب سے وہ مولانا مودودی کے لئے بڑی پریشان کن ثابت ہوئی۔ اس کا مواد اتنا تفصیلی تھا۔ اصولی باتوں کے حوالے سے تو میرا بیان بڑا مدلل تھا۔ دوسرے لوگوں کے بیانات میں کچھ ایسے واقعات تھے، خیانت کے، اخلاقی گراوٹ کے۔ یہ دونوں رُخ اتنے واضح ہو کر سامنے آئے کہ مولانا مودودی پریشان ہو گئے۔ تو اس پر مولانا نے جو روش اختیار کی وہ بہت ہی قابلِ افسوس تھی۔ اس رپورٹ پر پندرہ روز تک شوریٰ کے اجلاس نے غور کیا اور اجلاس کا اختتام تو ہوا ایک مصالحتی قرارداد پر۔ کیونکہ شوریٰ دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی اور نصف سے زائد ارکان کی رائے یہ تھی کہ اب ہمیں سیاست سے اپنا دامن بچا کر اسلام کی اصولی دعوت کے لئے کام کرنا چاہیئے جبکہ مولانا مودودی کی رائے اور کچھ حضرات کی رائے یہ تھی کہ جس طرح ہم کام کر رہے ہیں وہ سلسلہ چلتا رہنا چاہیئے اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ تو اس طرح کا کچھ کھچاؤ پیدا ہوا کہ پھر مصالحت کی بات اور بین بین معاملہ طے ہوا اگرچہ اصولی انحراف نہیں ہوا لیکن یہ محسوس ہوتا ہے کہ سیاسی معاملات میں زیادہ مشغولیت کی وجہ سے ہمارا کام متاثر ہوا ہے اور اب کوشش کریں گے کہ جو کمی رہ گئی ہے اس کی تلافی کی جائے۔ واضح اقرار نہیں تھا کہ غلطی ہوئی ہے اور اصولی موقف سے انحراف کیا گیا ہے۔

- - - - - - - - - - - -

قرارداد پاس کر کے دعا کر کے شوریٰ کا اجلاس ختم ہو گیا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ اجلاس کے بعد شوریٰ کے ارکان نے اپنے اپنے علاقوں میں جا کر اس قرارداد کی جو توضیح کی تو ہر ایک نے اپنے اپنے انداز میں کی۔ دو مخالف نقطہ نظر جو بن چکے تھے تو کوئی کچھ کہہ رہا تھا کوئی کچھ کہہ رہا تھا تو اس پر ایک ہنگامہ جماعت کے اندر ہو گیا۔ تو پھر مولانا مودودی پر بھی کیا افتاد ہوئی۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان پر شدید ردِ عمل ہوا۔ انہوں نے ایک خط لکھ دیا جائزہ کمیٹی کے ارکان کو کہ میں یہ محسوس کرتا ہوں چاہے آپ نے ارادہ نہ کیا ہو نیتاً نہ کیا ہو لیکن آپ نے جماعت کے خلاف ایک سازش کی ہے اور ایک سازش کے ذریعے ہی ایسے حالات پیدا کئے ہیں کہ میں شوریٰ کے اندر بھی اپنا نقطہ نظر صحیح طور پر پیش نہ کر سکا اور مجبوراً مجھ سے ایک ایسی قرارداد پر دستخط کروا لئے گئے جو مجھے پسند نہ تھی۔ اور اب میں آپ لوگوں کو آپشنل دیتا ہوں کہ آپ شوریٰ سے استعفیٰ دے دیں۔ یا میں آپ لوگوں کا معاملہ ان حلقوں کے سپرد کر دوں گا جن سے آپ منتخب ہو کر آئے ہیں۔ کہ وہ آپ کی رکنیت کالعدم کریں چونکہ میں آپ حضرات کے ساتھ جماعت کی سربراہی نہیں کر سکتا۔

مولانا کا یہ اقدام اتنا شدید تھا کہ اس سے جماعت میں شدید انتشار پیدا ہوا۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے شدید خط لکھا کہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ پہلے زبانی سمجھانے کی کوشش کی پھر خط لکھا کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ یہ کیا

آمرانہ روش ہے اور آپ اپنے مخلص ساتھیوں کی نیت پر حملہ کر رہے ہیں۔ مولانا مودودی اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ اصلاحی صاحب نے بہت ہی گرم خط لکھا تو انہوں نے جماعت کی امارت سے استعفیٰ دے دیا۔ یہ اخبارات میں چھپ گیا۔ اور جماعت میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ کچھ لوگ درمیان میں پڑے، مصالحت کروائی۔ پھر ماچھی گوٹھ میں ایک اجتماع ہوا۔

جماعت کے ارکان کا فروری ۵۷ء میں یہ اجتماع بلایا گیا تھا اس مقصد کے لئے کہ جماعت کی پالیسی کے بارے میں جو مختلف نقطۂ نظر ہیں ان پر وہاں کھل کر گفتگو ہوگی۔ اور غور کر کے فیصلہ کیا جائے گا کہ کدھر جانا ہے۔ لیکن کچھ حضرات اجلاس سے پہلے ہی مصالحت کرانے کے لئے میدان میں آگئے۔ مولانا ظفر احمد انصاری نے اس میں خاصا کردار ادا کیا۔ مذاکرات کے وہ بادشاہ ہیں۔ مولانا اصلاحی اور مودودی صاحب کے درمیان یہ طے کروا دیا کہ تم لوگ ایک مصالحت پہلے ہی کر لو ورنہ اگر جماعتِ اسلامی کے ارکان کے سالانہ اجتماع میں یہ باتیں زیرِ بحث آگئیں تو جماعت ختم ہو جائے گی۔ تو پھر ایک مصالحت کر لی انہوں نے۔ اب میں کیونکہ شوریٰ میں نہیں تھا لیکن مجھے معلوم ہوا تو میں نے ایک خط لکھ دیا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہاں ان مسائل پر گفتگو نہیں ہوگی اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس اجتماع میں شریک ہونا لا حاصل ہے۔ لہٰذا میں اس اجتماع میں شریک نہیں ہوں گا۔ اور یہیں سے میں اور میرے کچھ ہمخیال ساتھی آپ کو استعفیٰ بھیج دیتے ہیں۔ جواب دیا گیا کہ آپ آئیے اور آپ کو ضرور موقعہ دیا جائے گا۔ جب ہم وہاں گئے تو فضا بدلی ہوئی تھی، مصالحت ہو چکی تھی۔ بڑے لوگ تو بیٹھ گئے پیچھے اور چپ ہو گئے یا مولانا مودودی کی تائید کرنے لگے۔ اب سامنے میں ہی رہ گیا۔ یا پھر ارشاد احمد حقانی نے کچھ بات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن زیادہ جو معاملہ تھا مجھ سے متعلق رہا۔ میں نے اپنے بیان کو وہاں پڑھنے کی کوشش کی۔ اوّل تو اس کا مجھے موقعہ بھی نہیں دیا گیا۔ بڑی مشکل سے اجازت ملی وہ بھی محدود وقت کے ساتھ۔ پھر اس پر ہوٹنگ بھی ہوئی۔ بہر حال اس کا نتیجہ کچھ نہ نکل نہ سکا سوائے اس کے کہ اس اجتماع نے مولانا مودودی پر اپنے اعتماد کا اظہار کر دیا۔ کیونکہ دوسرا جو نقطۂ نظر تھا اکابر کی زبان سے تو وہ سامنے آیا ہی نہیں۔

اسی اثناء میں ترجمان القرآن میں مولانا مودودی کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں انہوں نے میرا نام لئے بغیر اپنا یہ نقطۂ نظر بیان کیا تھا کہ اختلاف کرنا ضعفِ ارادہ کے مساوی اور اس کی علامت ہے جن لوگوں کی اپنی ہمتیں جواب دے گئی ہیں اور اب اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں۔ اس مضمون کے بعد پھر میں نے اعتکاف کی حالت ہی میں اپنا استعفیٰ لکھ دیا۔ جب نیتوں پر شک ہو جائے تو دینی کام میں پھر شراکت نہیں چلتی۔ یہ تو سیاسی جماعتیں ہوتی ہیں جن میں سب ایک دوسرے کو چور سمجھنے کے باوجود بھی اکٹھے رہتے ہیں۔ لیکن دینی کام میں تو اخلاص اور باہمی اعتماد ہی سے بات بنتی ہے۔

س : اسلام میں تنظیم سازی کے لئے مقاصد کے تعین کے ساتھ ساتھ کیا ان کے حصول کے لئے لائحۂ عمل اور دائرۂ کار بھی معین کر دیا گیا ہے؟

ج : ان چیزوں پہ دو اور دو چار کی طرح احکامات آپ کو کتاب و سنّت میں نہیں ملیں گے۔ بلکہ ان میں اکثر باتوں کا ہم استنباط کرتے ہیں۔ کتاب اللہ سے حدیث سے اور سیرتِ رسولؐ سے۔ اس سلسلہ میں میرا جو حاصلِ مطالعہ ہے وہ میں آپ کے سامنے رکھوں گا۔ اسلام میں جس طرح کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ جس شعوری فکر پر میں نے سمجھا کہ جماعتِ اسلامی کی اساس تھی اس میں میں نے شعوری طور پہ ۵۴ء میں شمولیت اختیار کی۔ اس سے پہلے کے دور کو میں اپنی جذباتیت کا اور غیر شعوری دور تصوّر کرتا ہوں۔ اس میں یہ ہے کہ تین لیول ہیں مقاصد کے۔ پہلا لیول ہے خود اسلام پر عمل کرنا، اسلام پہ کاربند ہونا۔ اس کے لئے ہمیں ایمان اور یقین کی ضرورت ہے۔ ایمان ہوگا تو اسلام پر عمل کریں گے نہیں تو کیسے عمل کریں گے۔ پھر تو قول و فعل میں تضاد ہوگا۔ منافقت ہوگی، ریاکاری ہوگی۔ دوسرا درجہ ہے دعوت اور تبلیغ کا۔ تیسرا اور بلند ترین مقام ہے اللہ کے دین کو قائم کرنا، غالب کرنا، نافذ کرنا، جس کو میں جدید اصطلاح میں کہتا ہوں اسلامی انقلاب برپا کرنا۔ یہ سب سے بلند ترین درجہ ہے لیکن میں کہا کرتا ہوں کہ تین منزلہ عمارت ہو تو سب سے اہم پہلی ہے۔ کیونکہ سارا بوجھ تو اس نے اٹھایا ہوا ہے۔ اگر وہ مضبوط نہ ہوگی تو دوسری اور تیسری دھڑام سے گر پڑیں گی۔ اس سے بھی زیادہ اہم وہ بنیاد ہے کہ جس پہ پہلی منزل کھڑی ہے۔ میرے نزدیک ایمان کی حیثیت تو بنیاد کی حاصل ہے ——— پہلی منزل کے لئے چار ستون ہیں نماز روزہ زکوٰۃ اور حج اور اس کے اوپر ہیں حلال و حرام کے احکامات اوامر اور نواہی کی چھت۔ دوسری منزل ہے دعوت "امر بالمعروف نہی عن المنکر" شہادت علی الناس، دعوت الی اللہ اور تیسری منزل ہے اقامتِ دین، اسلامی انقلاب یا دین کا غلبہ تو بلند ترین عمارت یہ ہے اور اہم ترین بنیاد ہے جس کو میں ایمان سے تعبیر کرتا ہوں۔

اب ان تینوں کے حصول کے لئے جو لائحۂ عمل ہے اور جو اس کے لئے تنظیمی ہیئت ضروری ہے وہ کچھ مختلف ہیں۔ مثلاً صرف مسلمان بننے کے لئے ایمان لانے کے لئے صوفیاء کا طریق کار کہ ذکر اور مراقبے وغیرہ سے ایمان کو تقویت ہوتی ہے۔ دین کے لئے اخلاص پیدا ہوتا ہے۔ علماء جو کام کرتے ہیں کہ مسجد ہے، خطاب ہے، درس ہے۔ یہ بھی ایک تنظیمی ہیئت ہے۔ اس کے ذریعے سے بھی دین کے کام کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ مسلمانوں کو معلوم ہوتا ہے کہ حلال کیا ہے، حرام کیا ہے! اور جائز کیا ہے؟ ناجائز کیا ہے۔ پہلے لیول کے لئے ہمارے یہ ادارے، علماء کا ادارہ، درس و تدریس کا نظام اور اولیاء کا

سلسلہ یہ دونوں کافی ہیں۔ اب دوسرے لیول پر آئیے تو ضرورت پیش آئے گی کہ کچھ ادارے وجود میں آئیں۔ جو ذرائع ابلاغ کو زیادہ استعمال کریں اور اس میں بھی مختلف درجے ہیں لوگوں کے ان کی ضروریات کو پورا کیا جائے۔ مثلاً دانشوروں کو ان کی ذہنی سطح کے مطابق اسلام کا پیغام پہنچایا جائے۔ اور جو عوام ہیں ان کو ان کی سطح پر اسلام کی دعوت دی جائے۔ مسلمانوں کو اسلام سے روشناس کرانے کا انداز اور ہوگا۔ غیر مسلموں کے لئے اور انداز اپنایا جائے گا۔ دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت کے لئے ضرورت ہوگی کچھ ادارے وجود میں آئیں۔ وہ انجمنیں بھی ہو سکتی ہیں۔ قرآن حکیم کی اشاعت کے لئے انجمنیں قائم کی جائیں۔ یا یہ کہ ایسی اکیڈمی قائم کی جائے جو لوگوں کو تیار کرے کہ وہ علمی سطح پر دوسروں تک اسلام کی دعوت پہنچائیں۔ ایسے تبلیغی ادارے قائم ہوں جو مبلغین تیار کریں۔ ایسے ادارے تشکیل دیئے جائیں کہ جن میں مناظرین کو تربیت دی جائے۔ اس قسم کے ادارے جب قائم کئے جائیں گے تو ظاہر ہے ان کا کوئی سربراہ ہوگا کوئی منتظم ہوگا مختلف شعبوں کے حوالے سے کوئی انچارج وغیرہ مقرر کئے جائیں گے۔ یہ ساری چیزیں جائز ہیں اور انہیں اختیار کیا جاسکتا ہے۔ ذرائع ابلاغ جو بھی میسر ہیں ان کے ذریعے اگر باطل کا پرچار ہو رہا ہے اور وہ اتنے مؤثر ہیں کہ اگر ہم نے انہیں استعمال نہ کیا تو حق کی دعوت باطل کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔ تو میرے نزدیک اس دوسرے مرحلے کے لئے یعنی دین کی نشر و اشاعت کے لئے ان تمام ذرائع کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔

البتہ جب ہم تیسرے لیول پر آتے ہیں، وہ تیسرا لیول اقامت دین کی جدوجہد، دین کو قائم کرنے کی جدوجہد، دین کے غلبے کی جدوجہد کا ہے۔ تو یہ ایک پورے نظام کو بدلنے کا معاملہ ہے۔ صرف کسی نظریے کے پھیلانے کا معاملہ نہیں ہے۔ جس نظام کو بدلنا ہے اس میں مراعات یافتہ طبقے ہوتے ہیں جن کے خصوصی مفادات ہوتے ہیں۔ اختیارات اور اقتدار کے حامل طبقات ہوتے ہیں تو جن لوگوں کے مفادات کسی نظام کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں وہ کبھی نہیں چاہتے کہ اس نظام کو بدلا جائے۔ وہ ہر حال میں اس نظام کو قائم اور جاری و ساری رکھنے کی کوشش کریں گے۔ تو اس کے لئے ایک انقلابی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ نظام کو بدلنے کے عمل میں مزاحمت بڑی شدید ہوگی، کشمکش بڑی شدید ہوگی۔ اب اس کا میرے نزدیک جو آئیڈیل، نمونہ ہے وہ حضورؐ کی سیرت ہے۔ اس جدوجہد کے لئے جب ہم قریب سے قریب نہیں جائیں گے سیرت نبویؐ کے تو ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس بات سے کوئی شخص اختلاف نہیں کر سکتا کہ حضور نبی کریمؐ نے صرف تبلیغ نہیں کی بلکہ انقلاب بھی برپا کیا۔ صرف آپؐ نے اسلام کے پیغام کو پھیلایا نہیں بلکہ اللہ کے کلمے کو بلند کیا۔ تو وہاں تبلیغ کے لئے بھی ہمارے لئے پورا اسوہ موجود ہے اور وہ تبلیغ محض مذہبی تبلیغ نہیں ہے۔ جس طرح کہ عیسائیت میں ہے۔ تو وہ انقلابی

تبلیغ اور پھر انقلاب کے مراحل۔ اس کے لئے تنظیم کی بنیادیں کیا ہوں گی۔ یہ سب ہمارے لئے کامل نمونہ حضورؐ کی سیرت میں ہے۔ اور میں سیرت پر زیادہ زور دیتا ہوں بجائے سنت کے۔ اس لئے کہ سنت کے لئے ہمارا ذہن منتقل ہوتا ہے احادیث کی کتابوں کی طرف۔ یقیناً مستند ذریعہ وہی ہے ہمارے پاس لیکن حدیث کی کتابوں میں یہ چیز اس واقعاتی ترتیب کے ساتھ موجود نہیں ہے۔ یہ مسائل کی ترتیب کے ساتھ ہیں حدیث کی آپ کوئی بھی کتاب اٹھائیں گے تو پہلے طہارت کے مسائل ہی ہوں گے، پھر نماز کے مسائل آئیں گے، زکوٰۃ کے مسائل ہوں گے۔

لیکن ایک انقلاب کے جو مراحل ہیں ان میں کیا ترتیب ہوتی ہے! وہ اصل میں سیرت سے راہنمائی ملتی ہے۔ حضورؐ نے پہلے کیا کیا پھر کیا کیا، پہلے دور کا کیا تقاضا تھا، دوسرے دور کا کیا تقاضا تھا کس وقت تک آپ نے عدم تشدد کا راستہ اختیار کیا اور کوئی جوابی کارروائی نہیں کی چاہے صحابہؓ پر تشدد ہوا اور آپؐ پر ہوا ذاتی طور پر۔ پھر کب مرحلہ آیا کہ آپ نے اقدام کیا اور چیلنج فرمایا کفار کو اور ان کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن لیا تو یہ ساری چیزیں ہمیں سیرت سے ملتی ہیں۔ اس لئے میرے نزدیک جو طریق کار ہے وہ بیعت کے ذریعے ہے۔ وہ بیعت ہے سمع و طاعت فی المعروف اور بیعت جہاد۔ یہ دو اصطلاحات ہمیں حدیث سے بھی ملتی ہیں۔ سیرت سے بھی ملتی ہیں۔ حضورؐ کو تنظیم کے لئے کسی بیعت کی ضرورت نہیں تھی۔ کہ وہ تو رسولؐ تھے اور جو ایمان لے آیا وہ خود بخود مطیع ہے۔ ایک علیحدہ سے بیعت کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن حضورؐ نے یہ بیعتیں اس لئے لیں تاکہ بعد والوں کے لئے ایک نظیر اور ایک اسوہ قائم ہو جائے۔ اقامتِ دین کے لئے جو تنظیم قائم کی جائے گی اس کا ڈسپلن آرمی ڈسپلن ہے کہ جو حکم دیا جائے مانا جائے گا۔ جب حکم دیا جائے حرکت کرے اور جب حکم دیا جائے رک جائے۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو انقلاب نہیں آسکتا اس لئے کہ وہ تو بڑا سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ ایک مضبوط نظام کے ساتھ جس کی جڑیں زمین میں گہری ہوتی ہیں جس کے ساتھ لوگوں کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ ڈھیلی ڈھالی تنظیم ایک نظام کو اکھاڑ کر اس کی جگہ ایک دوسرا نظام نہیں لاسکتی تو یہ مضبوط نظام بیعت کے ذریعے سے قائم ہوتا ہے۔

ایک شخص کھڑا ہوتا ہے نیکی کے کاموں کے لئے کہ کون ہے جو میرا ساتھ دے۔ جو لوگ اس سے متفق ہوں گے وہ اس کے ساتھ آجائیں گے اور معاہدہ کریں گے کہ جب تک آپ ہمیں کتاب و سنت کے دائرے میں رہتے ہوئے حکم دیں گے، ہم اس کی تعمیل کریں گے۔ اپنی جو رائے ہوگی وہ پیش کر دیں گے لیکن آخری فیصلہ آپ کا ہوگا۔ وہ گنتی سے نہیں ہوگا۔ آپ کی صوابدید پر ہوگا۔ ہاں اگر آپ شریعت کے خلاف حکم دیں گے تو ہم نہیں مانیں گے۔

س : حضورؐ نبی کریمؐ کے دَور میں کسی باقاعدہ تنظیم کی کوئی صورت موجود تھی؟
ج : حضورؐ کے زمانے میں تو جو آپؐ پر ایمان لے آیا وہ گویا آپؐ کی جماعت میں شامل ہوگیا۔ اس لئے کہ باقی ماحول تو کفّار کا ہے۔ حضورؐ نے اپنی ذات میں اسلام کا معیار ہیں۔ جو حضورؐ سے منسلک نہیں وہ مسلمان ہی نہیں چاہے وہ بڑے سے بڑا متقی ہو، موحّد ہو، سب کچھ ہو۔ اس لئے کسی اضافی تنظیم کی کیا ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ نے مکّہ والوں سے بیعت بھی نہیں لی۔ اس لئے کہ جب تک اتنی محدود سی جمعیت تھی اور حضورؐ چوبیس گھنٹے موجود ہیں ان کے درمیان ہر حکم آپؐ براہِ راست دے رہے ہیں۔ لہٰذا آپؐ نے کسی اور کو وہاں امیر مقرر نہ کیا۔ نہ کوئی جماعت نہ کوئی بیعت۔ وہ ایک فطری نظام ہے۔ حضورؐ موجود ہیں۔ اور آپؐ خود بخود امیر ہیں۔ حضورؐ کبھی سپہ سالار ہوتے ہیں، کبھی حضورؐ قاضی ہوتے تھے اور امیر مملکت کی حیثیت سے وفود سے ملتے۔ تو وہ ایک فطری جماعت تھی۔ جب مدینے کے لوگ ایمان لائے تو وہاں پر آپؐ نے بارہ نائبین مقرر کئے۔ اور اس وقت آپؐ نے مدینے والوں سے بیعت لے لی۔ اس بیعت میں یہ تھا کہ ہم آپؐ کا حکم مانیں گے۔ سرتابی نہیں کریں گے اور آپؐ جس کو امیر مقرر کریں گے اس کی اطاعت کریں گے۔ لیکن کسی باقاعدہ جماعت کا تصوّر حضورؐ کے دَور میں نہیں تھا اس کے بعد بھی خلافتِ راشدہ جب تک رہی تو حکومت اور جماعت وہ سب ایک ہی تھے۔ ایک حکومت، ایک جماعت ایک امیر، وہ امیر مذہبی تھا، وہ امیر سیاسی بھی تھا۔ سیاست اور مذہب میں تو تفریق نہیں تھی اُس وقت ـــــ اب جب خلافتِ راشدہ ختم ہوگئی اب مسئلہ پیدا ہوا۔ ایک تو حکمران ہیں وہ مسلمان ہیں لیکن بہر حال اس معیار کے نہیں ہیں کہ لوگ دینی معاملات میں بھی ان سے رجوع کر سکیں۔

لہٰذا ایک بیعت تو ہوتی تھی خلفائے بنو امیّہ اور بنو عبّاس کی۔ یہ تو ہوگئی سیاسی بیعت حکومت کی بیعت اور ایک بیعت اب شروع ہوگئی اولیاء کی کہ یہ ہمارے دینی پیشوا ہیں۔ ان کے پاس ہم جائیں گے دینی رہنمائی کے لئے۔ یہ ہمیں اللہ کے رستے پر چلائیں گے۔ اب یہ تقسیم ہوگئی کہ دو بیعتیں ہوگئیں۔ حضورؐ کی زندگی میں ایک ہی تھی۔ اچھا جب ہمارا حکومت کا نظام ختم ہوگیا۔ کہیں انگریز آگیا، کہیں کوئی اور آگیا تو اب وہ بیعتِ حکومت تو ختم ہوگئی نا۔ لیکن وہ بیعتِ ارشاد چلتی رہی۔ یہ سہروردیہ سلسلہ ہے یہ چشتیہ سلسلہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ ــــ کیونکہ حکومت کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ لہٰذا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ البتہ اب جب دوبارہ تحریکیں اُٹھیں مسلمانوں کی بلکہ صحیح الفاظ میں اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے۔ وہ پھر بیعت ہی کی بنیاد پر ہی اُٹھیں۔ جس طرح کہ سیّد احمد شہید کی تحریک بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے بیعت لی اور اس کی بنیاد پہ جمعیت فراہم کی اور جہاد کیا۔

س : آپ کی گفتگو سے مجھے کچھ اس طرح کا تاثر ملا ہے کہ آپ انتخابات وغیرہ کے مخالف ہیں۔ یہ فرمائیں کہ آپ اقامتِ دین کے لئے جو کام کر رہے ہیں اور جب ملک میں الیکشن ہوتے ہیں اس میں ہر طرح کے لوگ حصّہ لیتے ہیں تو کیا آپ جیسے لوگ جو دین کی اقامت کا پرچم بلند کئے ہوئے ہیں الیکشن کے ذریعے کو لادین عناصر کے لئے کھلا چھوڑ دیں گے یا ان کے مقابلے کے لئے کوئی لائحہ عمل اختیار کریں گے۔ میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ ایک دینی جماعت کے سربراہ کی حیثیت سے انتخابات کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

ج : اس سوال کا جواب دینے سے پہلے میں یہ وضاحت کر دوں کہ اس حوالے سے میری گفتگو زیادہ تر استنباطی اور اجتہادی نوعیت کی ہوگی۔

میں اصولاً یہ بیان کر دوں کہ میرے نزدیک کسی بھی شخص یا جماعت کے لئے سب سے پہلا جو فیصلہ کرنے والی بات ہے وہ یہ ہے کہ جس ملک میں وہ کام کرنا چاہتی ہے۔ آیا اس کا نظام بنیادی طور پر صحیح ہے اور صرف چلانے والے ہاتھ غلط ہیں۔ یا یہ کہ کچھ جزوی خرابیاں ہیں۔ یا یہ کہ نظام ہی بنیادی طور پر غلط ہے۔ یہ دو چیزیں ہیں بڑی۔

ایک تو ہے جزوی اصلاح کا کام اور ایک ہے بنیادی اصلاح کسی نظام کی۔ تو یہ جو بنیادی نظام کو بدلنے والی بات ہے یہ انقلابی جد و جہد کا کام ہے۔ جزوی اصلاح کے کام کئی طرح کے ہو سکتے ہیں۔ سماجی اصلاح یا پھر سیاسی اصلاح۔ اس کی مثال میں یہ دیا کرتا ہوں کہ جیسا کہ امریکہ ہے' برطانیہ ہے۔ جو سیاسی پارٹیاں وہاں موجود ہیں ان کے نزدیک ان ملکوں کا نظام غلط نہیں ہے۔ اختلاف جزوی باتوں میں ہو سکتا ہے مثلاً خارجہ پالیسی یا دفاعی پالیسی میں۔ تو وہاں تو ہوگا سیاسی عمل۔ اس لئے کہ نظام کو نہیں بدلنا ہے۔ نظام کو چلانے والے ہاتھ بدلنے ہیں۔ لیکن فرض کیجئے کہ امریکہ یا برطانیہ میں اگر کمیونسٹ لوگ ہوں جن کے نزدیک وہ نظام ہی غلط ہے تو ظاہر بات ہے وہ وہاں انقلاب لانا چاہیں گے۔ وہ الیکشن میں کبھی حصّہ نہیں لیں گے۔ کیونکہ الیکشن میں جا کر ان کی توانائیاں ختم ہو جائیں گی۔ وہ تو انقلابی نظام کے ذریعے سے ہی نظام کو بدل سکتے ہیں۔ یہ ہے میری اصل سوچ۔ میرے نزدیک ہمارا نظام غلط ہے۔ یہ سارا سود خورانہ اور مفاد پرستانہ اور استحصالی نظام جو ہے یہ سارا حرام کے اوپر قائم ہے۔ تو اس میں جزوی اصلاح سے کچھ نہیں ہو سکتا اس میں نہ سماجی اصلاح کارگر ہو سکتی ہے۔ نہ اس میں صرف اخلاقی تعلیم کافی ہو سکتی ہے۔ نہ اس میں سیاسی عمل سے کوئی تبدیلی آئے گی۔ سیاسی عمل سے نظام برقرار رہتا ہے۔ وہی لوگ آگے آتے ہیں جو اس نظام میں جڑیں گہری رکھتے ہیں۔ تو ایسے نظام میں جزوی اصلاح سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ مفاد پرست اور مراعات یافتہ طبقہ سرمایہ دار اور زمیندار لوگ ہی بھاری اکثریت سے ایوانِ اقتدار تک پہنچتے ہیں

وہ نظام تو بدلنے نہیں دیں گے آپ کو۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں جب بھی الیکشن ہوا اکثریت میں ری پبلکن پارٹی ہو یا پیپلز پارٹی آپ کو ہمیشہ وہی چہرے برسرِ اقتدار نظر آئیں گے۔ یہ لوگ اپنے مفادات کو دیکھیں گے اور اس نظام کو برقرار رکھیں گے۔ اس لئے جہاں تک الیکشن میں حصہ لینے کا تعلق ہے میں اس کو حرام بالکل نہیں سمجھتا۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس ذریعے سے اسلام لاسکتا ہے وہ کرے۔ میرے نزدیک اس سے اسلام کا نظام قائم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سارا سلسلہ وقت کا ضیاع ہے۔ دولت کا ضیاع ہے، صلاحیتوں کا ضیاع ہے اس سلسلے میں میرا موقف بالکل واضح ہے۔ اور اسی بنیاد پر تو میں نے جماعتِ اسلامی سے علیحدگی اختیار کی تھی لیکن میں الیکشن کی مخالفت میں وہ طرزِ عمل اختیار نہیں کرنا چاہتا جو جماعتِ اسلامی نے تحریک پاکستان کے متعلق کیا تھا کہ جماعت نے مسلم لیگ سے صرف اختلاف نہیں کیا بلکہ اس کی تحریک کو کفر کے درجے تک پہنچا دیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ الیکشن میں حصہ لینا ناجائز ہے۔ یہ ایک مباح چیز ہے، جائز ہے۔ پھر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ہم اسلامی انقلاب لانے میں کامیاب ہوگئے تو پھر اس اسلامی ریاست کو چلانے کے لئے الیکشن کا کوئی نہ کوئی نظام قائم کرنا پڑے گا۔ چاہے اس میں اصول ہمارے مختلف ہوں۔
اس میں عورتوں کا ووٹ ہو یا نہ ہو کس عمر کے شخص کو ووٹ دیا جائے جائے۔ تعلیم کا بھی معیار مقرر کردیا جائے۔ اخلاقی اعتبار سے بھی یہ پابندی عائد کر دی جائے کہ اگر کوئی سنگین جُرم کسی سے سرزد ہو جائے تو ہمیشہ کے لئے اس کا ووٹ کا حق ساقط کر دیا جائے۔ بہرحال ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی نہ کوئی انتخابی نظام رائج کرنا پڑے گا اس کے بغیر اسلامی ریاست نہیں چل سکتی لیکن اسلامی ریاست قائم کرنے کے لئے اس الیکشن میں حصہ لینا قطعاً مفید نہیں ہے کہ یہ کام صرف انقلابی عمل ہی سے انجام پاسکتا ہے۔

س : اس انقلابی عمل کے خدوخال کیا ہوں گے؟ اس پر بھی کچھ روشنی ڈال دیجئے۔

ج : میرے نزدیک کسی بھی انقلاب کے چھ مراحل ہوتے ہیں۔ پہلا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ جو نظام آپ لانا چاہتے ہیں اس کی جو نظریاتی اساس ہے اس کو آپ نے پھیلانا ہوگا۔ اور جو قائم نظام ہے اس کی تردید کرنا ہوگی۔ اس پر تنقید کرنی ہوگی۔ اسے باطل و فاسد اور استحصالی دلائل و شواہد سے ثابت کرنا ہوگا۔ کیونکہ ہر نظام کسی فلسفے پر قائم ہوتا ہے۔ مارکس ازم کی بنیاد پر اگر آپ نے انقلاب لانا ہے تو پہلے اس کے اساسی نظریئے کو پھیلانا پڑے گا۔ اس کے لئے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ اپنے نظریئے کی تبلیغ اور جو غلط نظام قائم ہے اس کے نظریئے کی نفی۔ اس کے لئے سارے ذرائع ابلاغ، قوتیں پوری طرح سے استعمال کی جائیں۔
دوسرا مرحلہ، اب جو لوگ آپ کے نظریئے کو ذہناً، قلباً اور شعوری طور پر تسلیم کر چکے ہوں ان کو ایک تنظیم کے تحت منظم ہونا چاہیئے اور یہ تنظیم ہونی چاہیئے آرمی ڈسپلن والی۔ تیسرا کام ہوگا ان کی تربیت کا۔ اب اس

میں فرق ہو جائے گا کہ اگر تو اشتراکی انقلاب برپا کرنا ہے تو خالص عسکری تربیت اور خالص تنظیمی تربیت۔ ڈسپلن کا خوگر بنا دینا کافی ہوگا۔ اخلاقی اصلاح کی ضرورت نہیں ہے لیکن اسلامی انقلاب لانا ہے تو افراد کی اخلاقی اور روحانی تربیت لازمی ہوگی۔ جہاں وہ خوگر ہو جائیں نظم کی پابندی کے اور مصائب کو برداشت کرنے کے اور قربانیاں دینے کے وہاں وہ ساتھ ہی عادی ہوں تزکیہ نفس کے، نماز، روزہ اور دین کے اوپر خود کار بند ہونے کے۔ یہ تین مراحل ہیں ابتدائی۔ اب چوتھا مرحلہ جو شروع ہو جاتا ہے پہلے مرحلے کے ساتھ ہی وہ یہ ہے کہ جب آپ نے دعوت دینا شروع کی تھی تو آپ نے کہا تھا کہ موجودہ نظام غلط ہے تو ظاہر بات ہے اس نظام کے ماننے والے غصے میں آئیں گے یا نہیں۔ تو وہ آپ پر تشدد کریں گے، مزاحمت ہوگی۔ شروع میں جب وہ سمجھیں گے کہ چند سر پھرے لوگ ہیں تو نظر انداز کریں گے۔ پھر مذاق اڑائیں گے، تمسخر کریں گے، چٹکیوں میں اڑائیں گے لیکن جب انہوں نے سمجھا کہ ان کے کچھ پاؤں جمتے جا رہے ہیں۔ ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور یہ لوگ ہمارے نظام کو متاثر کر سکتے ہیں تو پھر وہ جبر و تشدد، مار دھاڑ اور جیلوں میں ٹھونسو اور یہ کرو وہ کرو ہوگا۔ اس مرحلے میں عدم تشدد کو اپنا شعار بنانا ہوگا کوئی مزاحمت نہ کی جائے، صبر کیا جائے، جو تکلیف آئے اس کو برداشت کیا جائے۔ لیکن بدلہ نہ لیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتداء میں انقلابی کارکنوں کی تعداد اتنی کم ہوتی ہے کہ اگر وہ راست اقدام پر اتر آئیں تو کچل دیئے جائیں گے۔ تو اس لئے وہ ردِ عمل ظاہر کرنے کے بجائے اپنے اوپر مصیبتیں جھیلتے ہیں۔ لیکن ہاتھ نہیں اٹھاتے اس کا اثر یہ پڑتا ہے عوام پر کہ ان کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اچھا جب یہ محسوس ہو کہ ہمارے پاس طاقت اتنی ہے کہ ہم کوئی ڈائریکٹ ایکشن اب کر سکتے ہیں۔ ہماری جمعیت اتنی تعداد میں اور تربیت یافتہ ہے کہ ہم راست اقدام کر سکتے ہیں تو اس طرح پانچواں مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ ہے اقدام کا مرحلہ۔ وہ اقدام کیا ہوگا۔ آپ کسی بھی مسئلے کو لے کر موجودہ نظام کی جو دکھتی رگ ہے اسے چھیڑیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا کہ اب وہ نظام پوری طاقت کے ساتھ آپ کے خلاف حرکت میں آئے گا۔ اب مسلح تصادم کا آغاز ہوگا۔ اس مسلح تصادم کے بعد آخری اور چھٹا مرحلہ آتا ہے کہ پھر تخت یا تختہ۔ اب اگر پوری تیاری کر کے ہی اس مرحلے کا آغاز کیا ہے تو انقلابی جماعت کامیاب ہو جائے گی اور اگر تعداد کم تھی، تربیت میں کمی تھی، لوگ ایثار پیشہ نہ تھے، اپنے نظریئے کے ساتھ پکی وابستگی نہ تھی تو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔

اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ چھ مراحل جو میں نے گنوائے ہیں میں نے سیرتِ رسولؐ سے حاصل کئے ہیں۔ پہلے حضورؐ نے دعوت و تبلیغ شروع کی۔ جن لوگوں نے اسے قبول کیا انہیں جمع کیا

منظم کیا اور ان کی تربیت کی۔ یہ تینوں مرحلے مکے میں ہو رہے ہیں بارہ برس تک۔ ساتھ ہی یہ حکم ہے ان بارہ برسوں میں کہ ہاتھ مت اٹھانا۔ چاہے تمہیں قتل کر دیا جائے۔ حضرت سمیہؓ اور حضرت یاسرؓ دونوں کو شہید کر دیا ابوجہل نے۔ اور مسلمان آخر تھے ناتیس تھے چالیس تھے کچھ تو تھے۔ ان کا خون کھول رہا ہو گا۔ لیکن حکم تھا کہ ہاتھ نہیں اٹھانا۔ تو یہ چار مراحل مکّے کے دور میں مکمل ہو گئے۔ جیسے ہی ہجرت ہوئی، اللہ تعالیٰ نے یہ جگہ عطا کر دی۔ اس وقت تک مسلمانوں کی تعداد میں بھی خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہاں اب اقدام کرنے کی قدرت حاصل ہو چکی تھی تو ہاتھ بھی کھول دیئے گئے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ آج تک تمہارے ہاتھ بندھے ہوئے تھے مومنو، اب تمہارے ہاتھ کھول دیئے گئے۔ اب تم جواب دو۔ اب حضورؐ نے اقدام فرمایا۔ حضورؐ نے تجارتی راستوں پر اپنے دستے بھیجنے شروع کر دیئے۔ انہیں مخالفین کے لئے مخدوش بنا دیا گیا۔ مسلمانوں نے اپنی موجودگی کا احساس دلانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد مختلف غزوے ہوئے۔ بالآخر آٹھ ہجری کو مکّہ فتح ہو گیا اور اسلام غالب ہو گیا۔

ساتواں مرحلہ ہوتا ہے ہر انقلاب کا۔ ایک ملک میں کامیابی کے بعد اب اس انقلاب کی توسیع۔ اس انقلاب کو ایکسپورٹ کرنا۔ مثلاً فرانس کا انقلاب تھا تو صرف فرانس تک ہی نہیں رہا۔ روس کا انقلاب تھا روس تک نہیں رہا۔ حضورؐ کا انقلاب مکّے تک نہیں رہا وہ پھر پھیلا ہے۔ اس کا آغاز تو حضورؐ کے دور میں ہو چکا تھا لیکن خلافتِ راشدہ کے زمانے میں پھر اس کام میں بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ تو یہ ہیں انقلاب کے مراحل۔ اب اس میں ہمارے ہاں ایک تبدیلی آئے گی۔ وہ تبدیلی یہ ہے کہ چونکہ معاملہ مسلمانوں کا ہے تلوار اٹھانا مسلمان کا مسلمان کے خلاف یہ بہت ہی استثنائی حالت میں جائز ہو سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اب حالات اس قدر بدل چکے ہیں کہ عوام نہتّے ہوتے ہیں، حکومت کے پاس ہتھیار ہوتے ہیں، پولیس ہے، فوج ہے، اس طرح کی بہت ساری قوّتیں ہیں۔ لہٰذا یہ عملاً ممکن بھی نہیں رہا کہ کوئی مسلح جدوجہد کی جائے۔ لہٰذا یہاں یہ صورتحال ہو گی انقلاب کے پانچویں مرحلہ میں کہ پرامن مظاہرہ کیا جائے گا۔ آپ سڑکوں پر نکلیں گے۔ اگر آپ کے پاس منظم لوگ ہیں اور اتنی تعداد میں کہ آپ ان کو قابو میں رکھ سکتے ہیں تو اس طرح آپ پرامن مظاہرے کی صورت میں مطالبہ کریں گے۔ صاحب یہ کام دین کے خلاف ہے لہٰذا ہم یہ نہیں ہونے دیں گے۔ اب یا تو یہ ہو گا کہ حکومت آپ کی قوّت سے متاثر ہو کر آپ کی بات کو تسلیم کر لے گی اور ایک ایک کر کے منکرات تبدیل ہوتے جائیں گے اور اسلام آ جائے گا۔ لیکن اگر حکومت بنا لے اسے اپنی انا کا مسئلہ کہ ہم تو یہی کریں گے جو کر رہے ہیں اور ہم تو اس نظام میں تبدیلی نہیں لائیں گے تو اب ہو گا تصادم۔ لاٹھیاں برسیں گی، گولیاں چلیں گی، جیلوں میں ٹھونسا جائے گا، جو

بھی ہو اب اگر ان لوگوں میں ایثار و قربانی کا جذبہ ہے تو وہ جانیں دے دیں گے۔ تو جب لوگ قربانیاں دینے پر آجائیں گے تو کتنوں کو ماریں گے؟ شہنشاہ ایران نے کتنوں کو مار لیا۔ یہاں پاکستان میں بھٹو کو فوج نے جواب دے دیا تھا کہ ہم اپنے ہم وطنوں پر گولیاں نہیں چلائیں گے۔ لوگ سڑکوں پر نکلے ہوئے ہیں۔ کتنوں کو ماریں دو سو کو چار سو کو ہزار کو تو پھر ایک انقلاب آجائے گا۔ یہی واحد راستہ ہے جو قابل عمل ہے۔

ایک بات ذہن میں رکھئے کہ اس راستے میں آپ کو تمام مذہبی قوتوں کی تائید حاصل ہوگی۔ کیونکہ منکرات پر سب متفق ہیں۔ ہمارے ہاں فضائل میں یا نیکیوں میں تو اختلاف ہے کہ نماز اس طرح پڑھنے میں زیادہ ثواب ہے۔ یا اس طرح پڑھنا زیادہ موزوں ہے۔ یہ تو ہو گیا اختلاف لیکن منکرات میں اختلاف نہیں ہے کون سے مسلمان ہے چاہے وہ اہلحدیث ہو، بریلوی ہو، دیوبندی ہو، جسے یہ معلوم نہ ہو کہ اسلام میں پردہ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ بے پردگی منکر ہے۔ بے حیائی منکر۔ فحاشی منکر ہے۔ کون نہیں مانتا کہ سود حرام ہے۔ تو جو چیزیں حرام ہیں، منکرات ہیں، ان پر اتفاق ہے۔ لہٰذا اگر ان مسائل پر کوئی تحریک اٹھتی ہے تو سب عناصر اور جماعتوں کی تائید اسے حاصل ہوگی۔ جبکہ الیکشن کے راستے میں جہاں مخلصین آسکتے ہیں وہاں وہ لوگ بھی آسکتے ہیں جو محض اقتدار کے طالب ہوں گے۔ ایسی مثالیں ہمارے ہاں موجود ہیں کہ دینی جماعتوں میں لوگ آئے اور کامیابی کے بعد حکومتی پارٹی میں شامل ہو گئے۔

س : آپ تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے جو جدوجہد کر رہے ہیں دعوتِ حق کے لئے۔ آپ کیا تجزیہ کرتے ہیں کہ انقلاب کے لائحہ عمل کے حوالے سے آپ اس وقت کس مرحلہ میں کھڑے ہیں اور ابھی آپ کی منزل کتنی دور ہے!

ج : ابھی ہم بالکل ابتدائی مرحلے میں ہیں کہ دعوت، تنظیم اور تربیت۔ یہ کرنے کی ہم کوشش کر رہے ہیں۔ اس میں ہمارا مذاق اڑایا جا رہا ہے، تمسخر کیا جا رہا ہے مگر ہم اپنا کام کئے جا رہے ہیں۔

س : پاکستان میں جتنی اسلامی تنظیمیں قائم ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ وہ یہاں صحیح معنوں میں ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل اور دین کی اقامت کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں۔ اسلام کے حوالے سے جماعتوں کی ایک بھیڑ کی موجودگی میں آپ تنظیم اسلامی کا قیام کن مقاصد کے حصول کے لئے عمل میں لائے ہیں۔ آپ کے نزدیک اس نئی تنظیم کی ضرورت اور جواز کیا تھا!

ج : وہ جو پہلی تنظیموں کا جواز تھا۔ آخر جو تنظیم بھی بنی ہے اس سے پہلے بھی تو جماعتیں موجود تھیں نا تو پھر یہ نئی تنظیم کیوں بنائی گئی۔ یہ تو خیر الزامی جواب ہو گیا۔ لیکن اپنی تنظیم کے جواز کے حوالے سے میں عرض کروں گا۔ اسلام کے حوالے سے ہمارے ہاں جو تنظیمیں موجود ہیں۔ ان سب کے دل میں اسلام کا درد موجود ہے

اور اس امت کا۔ امتِ محمدؐ کا۔ سب یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کا بول بالا ہو اور مسلمانوں کے مسائل کو حل کیا جائے۔ تشخیص اور تجویز میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے۔ اب نبیؐ تو کوئی بھی نہیں کہ جس کی بات کو حرفِ آخر سمجھا جائے۔ لہٰذا حق پہنچتا ہے کہ ایک آدمی یا جماعت کی جو تشخیص یا نقطۂ نظر ہے اس سے اختلاف کیا جائے۔ تو اگر ایک شخص یہ کہتا ہے کہ میرے نزدیک مسائل کا حل اس طرح ہے جو اس سے اتفاق کرتا ہے وہ اس کے ساتھ چلا جائے اور اگر دوسرا شخص یہ کہتا ہے کہ میرا نقطۂ نظر یہ ہے تو جو اس سے اتفاق کرتا ہے وہ اس کیساتھ تعاون کرے۔ اس طرح متعدد جماعتوں کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ البتہ دینی جماعتوں کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ آپس میں تلخی نہ رہے۔ یہ سمجھیں کہ ہمارے مقاصد ایک ہیں بس صرف لائحہ عمل میں فرق ہے۔ اس کی میں مثال دیا کرتا ہوں حج کی۔ اگر آپ گئے ہوں گے۔ جب حاجی صاحبان روانہ ہوتے ہیں عرفات کو۔ آپ اندازہ کریں کہ کم از کم پچیس لاکھ افراد کو وہاں جانا ہوتا ہے۔ اب ان سب کی منزل عرفات ہے لیکن اب کوئی دس راستے بنا دیئے گئے ہیں۔ کوئی کسی راستے سے جا رہا ہے کوئی کسی راستے سے۔ کوئی پیدل جا رہا ہے، کوئی سواری کے ذریعے سے۔ مختلف گروہوں نے اپنے اپنے معلموں کے جھنڈے اٹھا رکھے ہیں تاکہ الگ سے شناخت رہے۔ اور کوئی حاجی گم نہ ہونے پائے۔ تو قافلے بھی علیحدہ ہیں، جھنڈے بھی علیحدہ ہیں، راستے بھی علیحدہ ہیں لیکن منزل ایک ہے تو اس طرح دین کے لئے مختلف جماعتوں میں کام کرنے والوں کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہمارا کام ایک ہے۔ اس کے لئے مختلف طریقِ کار پر ہم عمل پیرا ہیں لہٰذا مختلف تنظیموں کا وجود اور کسی نئی تنظیم کا قائم ہونا بالکل جائز ہے۔

س: کہا جاتا ہے کہ اسلام میں عہدہ طلبی اور اقتدار کے لئے مہم جوئی جائز نہیں۔ کیا نیکی کے فروغ، برائی کے تدارک اور دین کی اقامت کے لئے اقتدار کی طاقت کے حصول کے لئے جدوجہد بھی اسی ضمن میں آتی ہے؟

ج: ایک تو یہ ہوتا ہے کہ ہم عہدہ طلب کرنے کا مسئلہ پہلے رکھیں اور اصلاح کے عمل کو مؤخر کریں کہ جب ہمیں عہدہ اور اختیارات مل جائیں گے تو اصلاح کریں گے۔ یہ معاملہ تو ہے غلط۔ صحیح راستہ یہ ہے کہ آپ انقلاب کے عمل کو شروع کریں جس طرح کہ میں نے انقلاب کے مراحل کا ذکر کیا ہے۔ اور اگر آپ اپنے جدوجہد کے نتیجے میں اور اصلاح کی تحریک کے بعد ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ جہاں آپ کو اقتدار سنبھالنا پڑ جائے تو یہ تو ذمہ داری کا معاملہ ہے۔ پھر اس ذمہ داری کو پورا کرنا ہوگا۔ جس طرح کہ نبی کریمؐ نے اس ذمہ داری کو نبھایا۔ لیکن جب ایک اسلامی ریاست قائم ہو جائے اس میں عہدہ طلبی جائز نہیں۔ اس کے لئے ہمیں کوئی ایسا راستہ اپنانا ہوگا کہ لوگوں کی بہتر سے بہتر آراء ہو جائیں اس کے مطابق فیصلہ

کر لیا جائے۔ تو اس نظام میں ایسے افراد کی حوصلہ شکنی کی جائے گی جو از خود عہدہ کے طالب ہوں گے۔

س : کوئی ایسا نظام تشکیل دے رکھا ہے آپ نے کہ جس میں اقتدار کے حریص افراد کو آگے آنے سے روکا جا سکے۔

ج : ایسے کسی نظام کے خدوخال تو میں نے ابھی نہیں بنائے لیکن ایسا ممکن ہے اور وقت آنے پر ایسا نظام ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

س : آپ نے اسلامی انقلاب کے حوالے سے اپنے نقطۂ نظر کو بتایا ہے۔ لیکن جو دینی جماعتیں اقامتِ دین کے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے الیکشن کے راستے کو اپنائے ہوئے ہیں ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ آخر کوئی جواز تو ان کے پاس بھی ہوگا الیکشن وغیرہ میں حصّہ لینے کا۔

ج : اس حوالے سے جماعت اسلامی کا طرزِ عمل تو بہت افسوسناک ہے۔ جماعت نے ۵۱ء میں انتخابات میں حصّہ لیا تو اس کے لئے ایک متبادل نظام تجویز کیا تھا۔ اور امیدواری کو حرام قرار دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ پارٹی ٹکٹ کو حرام قرار دیا تھا۔ ایک پنچائتی نظام انہوں نے بنایا تھا کہ جو لوگ بھی ہمارے اس منشور سے متفق ہیں وہ ووٹر کا عہد نامہ پُر کریں گے۔ ان کی پھر پنچائتیں بنیں گی۔ وہ پنچائتیں اپنی نظر سے دیکھیں گی کہ کون ہے قابل، اہل اور صالح آدمی۔ اس کو وہ امیدوار منتخب کریں گی۔ پھر وہ شخص پیسہ نہیں لگائے گا۔ وہ شخص بھاگ دوڑ نہیں کرے گا۔ یہ پنچایتوں کا کام ہوگا کہ اس کے لئے بھاگ دوڑ کریں۔ اس کے لئے پیسہ بھی لگائیں۔ تو یہ تھا ایک آئیڈیل نظام، ایک بڑا خوبصورت نظام اور اسلام کے اصولوں کے مطابق۔ لیکن اس کے مطابق تو جماعت کو ایک سیٹ بھی نہ ملی تو جماعت کو اس میں ترمیم کرنی پڑی۔ گویا اگر زمانے نے ان کے ساتھ موافقت اختیار نہ کی تو انہوں نے زمانے کے ساتھ موافقت اختیار کر لی۔ تکلیف دہ پہلو اس میں یہ ہے کہ جماعت نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا تھا پھر ان ہی چیزوں کو اختیار کر لیا۔ جماعت کا معاملہ تو ہے افسوسناک۔ باقی جماعتوں کے پاس الیکشن کے مروّجہ نظام میں حصّہ لینے کا جواز کیا ہے اس کا مجھے پورے طور سے تو علم نہیں۔ شاید وہ یہ سمجھتے ہوں کہ وہ کسی عہدے کے حصول کے لئے الیکشن میں حصّہ نہیں لے رہے بلکہ دین کی طرف سے ایک ذمّہ داری ہے جسے پورا کرنے کے لئے وہ اس میں حصّہ لے رہے ہیں۔ تو یہ نیتوں کا معاملہ ہے جسے اللہ بہتر جانتا ہے۔ لیکن میرا اعتراض تو یہ ہے کہ اسلام کو قائم کرنے کے لئے بالفعل یہ طریقہ درست نہیں ہے۔

س : آج امتِ مسلمہ جس انتشار، خودغرضی، غلط رہنمائی اور قوتوں اور صلاحیتوں کے ضیاع کا شکار ہے اس کی ذمّہ داری کچھ نہ کچھ تو اسلامی تنظیموں پر بھی ڈالی جائے گی۔ آپ کا اس سلسلے

میں کیا موقف ہے !

ج : میرا ان تحریکوں کے بارے میں یہ نقطۂ نظر نہیں ہے جو آپ نے بیان کیا ہے بلکہ اس کو میں ایک وسیع تناظر میں لیتا ہوں۔ ہماری امّت کی چودہ سو سالہ تاریخ میں دو ہمارے دورِ عروج کے آئے ہیں، دو زوال کے آئے ہیں۔ پہلا عروج تھا عربوں کی قیادت۔ اسلام جو ہے سو فیصد اسلام وہ تو ہے حضورؐ اور خلافتِ راشدہ کا دور۔ اب آگے میں مسلمانوں کی تاریخ لے رہا ہوں۔ حضورؐ اور خلافتِ راشدہ کے بعد سب سے اعلیٰ دَور ہے بنو امیّہ کا۔ مسلمانوں کی تاریخ میں عروج و زوال کا سلسلہ ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ ایک عروج عربوں کی زیرِ قیادت تھا۔ بنو عباس کے نصف آخری دور میں ہمارا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں دوبارہ ابھارا اور ترک اقوام کو اسلام میں داخل کر دیا۔ یہ جو نیا خون آیا اسلام میں تو ایک نیا عروج آیا۔ پھر اس کے بعد زوال آیا ہے مغربی استعمار کے ہاتھوں۔ مغربی استعمار اپنے کمال کو پہنچا تو پھر اسلام پر زوال کا آسیب ختم ہونے لگا۔ یہاں سے اسلام کے عروج کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے اور اس میں وقت لگے گا ابھی۔ پھر اس کے کئی مراحل ہیں۔ مثلاً پہلے صرف آزادی کی تحریکیں چلیں ان کا دین سے اتنا گہرا تعلق نہیں تھا۔ لیکن ان تحریکوں نے بھی اسلام کے احیاء کے عمل میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ آزادی ملی ہے تو اب یہاں بات کرنے کا موقع ملنے لگا ہے کہ یہاں اسلام آنا چاہیئے۔ اس کے بعد جو تحریکیں چل رہی ہیں، جماعتِ اسلامی کی تحریک ہے، علماء کی تنظیمیں ہیں، دوسری اسلامی تنظیمیں ہیں۔ ان کے بارے میں میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہر تنظیم کو اس کا کریڈٹ دینا چاہیئے۔ جماعتِ اسلامی نے سینکڑوں جوانوں کو متحرک کیا۔ میں خود ان میں سے ایک ہوں۔ اسی طرح تبلیغی جماعت نے ہزاروں نوجوانوں کو مسجدوں کا رُخ دکھلایا ہے۔ گویا ہر تحریک کا کچھ نہ کچھ مثبت کردار ہے۔ لیکن حقیقت میں ہم اتنی پستی میں جا چکے تھے کہ اس سے ابھر کر آ جانا یہ کوئی دو چار یا دس سال کا معاملہ نہیں ہے۔ اس کے لئے ایک طویل عمل کی ضرورت ہوگی۔ اس میں جو کوئی بھی اپنا حصّہ ڈال رہا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔

س : کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے اِن علماء کرام نے اپنی ذمّہ داریوں کو ایک پیشے کی صورت دے دی ہے۔ علماء کے اس طرزِ عمل سے امّتِ مسلمہ میں جو بگاڑ اور خرابی جنم لے رہی ہے اس کے بارے میں آپ کا تجزیہ کیا ہے !

ج : آپ نے پیشے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ میں علماء کرام کے تذکرے میں اس کو پسند نہیں کروں گا لیکن اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں علماء کا ایک طبقہ درس و تدریس، امامت اور خطابت کے فرائض کے بدلے کچھ پیسے وغیرہ لیتا ہے اور اس اعتبار سے ایک مشابہت بننے سے ہو جاتی ہے میں

یہ سمجھتا ہوں کہ یہ چیز اسلام کے اساسی مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اسلام میں کوئی معین طبقہ مذہب کے حوالے سے تسلیم نہیں کیا جاتا لیکن یہ بالکل ابتداء ہی میں ہوگیا تھا کہ بعض لوگ جو ہمہ وقت دینی خدمات انجام دیتے تھے تو معاشرے کی طرف سے ان کے معاش کا کچھ اہتمام کر دیا جاتا تھا۔ یہ حضرت عمرؓ ہی کے زمانے میں کچھ تنخواہ اور وظائف وغیرہ کا تعین ہوگیا تھا اب جو صورت حال اس وقت ہے ایک تو یہ کہ جب مغربی استعمار یہاں آیا اس کے نتیجے میں ہمارے ہاں دو طبقات وجود میں آئے۔ ایک طبقہ وہ جس نے جدید تعلیم حاصل کی اور سرکاری ملازمتوں اور مختلف پیشوں میں وہ آگے بڑھ گیا۔ جب کہ علماء کرام نے اس وقت بڑے ایثار سے کام لیا۔ انہوں نے جدید تعلیم اور اعلیٰ معاش کے راستے اپنے اوپر بند کئے اور دینی علوم کی تحصیل کے بعد اسلام کی خدمت میں ہمہ تن منہمک ہوگئے۔ اس طریقہ سے ہمارے ہاں ایک طبقاتیت پیدا ہوگئی۔ ایک طبقہ علماء کا۔ ان کا درس و تدریس کا نظام علیحدہ ان کی وضع قطع، بود و باش، شکل و صورت، لباس، بالکل علیحدہ۔ اور دوسرا جو یونیورسٹیوں سے اور کالجوں سے پڑھ کر نکلتا ہے۔ ان دونوں میں بہت بعد ہوگیا ہے۔ میرے نزدیک علماء کے اس طبقہ کا علیحدہ وجود میں آجانا اسلام کے احیاء کے عمل میں مفید نہیں ہے۔ مضر ہے۔ لیکن اس کا الزام ہم علماء کو تو نہیں دے سکتے۔

س: ڈاکٹر صاحب! اب پاکستان میں اسلامائزیشن کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ موجودہ حکمرانوں کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے بہت اہم اقدامات کئے ہیں ـــ زکوٰۃ و عشر، بلاسود بینکاری نظام، اسلامی حدود کے نفاذ اور قاضی کورٹس کے قیام کو وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ آپ کا اس سلسلے میں کیا موقف ہے!

ج: اس سلسلہ میں آغاز میں مجھے بھی کچھ توقعات تھیں۔ جنرل ضیاء الحق کے بارے میں مجھے ذاتی طور پر علم تھا کہ وہ ایک نیک اور پابند صوم و صلوٰۃ مسلمان ہیں اور ان کا کچھ دینی مطالعہ بھی ہے۔ جب میں نے پہلی جلد شائع کی ہے تدبر قرآن کی اور یہ آپ ہی کے پریس میں چھپی تھی، چٹان پریس میں۔ جنرل ضیاء الحق اس وقت ملتان میں جی او سی تھے تو ان کے ایک جونیئر میرے پاس آئے تھے اور ان کے لئے کتاب لے کر گئے تھے۔ اب تدبر قرآن کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ اس کا ایک خاصا علمی معیار ہے۔ اس لئے اسے عام پڑھا لکھا آدمی نہیں سمجھ سکتا۔ جنرل ضیاء الحق کی اس کتاب سے دلچسپی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دینی ذوق کا ایک معیار ہوگا۔ ہماری قرآن کانفرنس ہوئی تھی تو اس موقعہ پر بھی انہوں نے از خود پیغام بھیجا تھا اور خواہش ظاہر کی تھی کہ اسے پڑھ کر سنایا جائے۔ تو اس سے ان کی دین کے ساتھ رغبت کا اظہار ہوتا ہے۔ میں نے اس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ میری جنرل ضیاء الحق

کو نصیحت ہے یا مشورہ کہہ لیں کہ آپ بھرپور طور پر پورے کے پورے اسلام کو نافذ کریں ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو انتہائی اہم موقع فراہم کیا ہے ۔ اس لئے آپ جراُت مندانہ اقدام کے ساتھ اسلام کے نفاذ کے لئے اقدام کریں۔ ساتھ ہی میں نے یہ کہا تھا کہ یہ معاشرہ اسے قبول نہیں کرے گا اور آپ کو اٹھا کر پھینک دے گا۔ لیکن آپ کا اس چیز کو قبول کر لینا کہ معاشرہ اگر اسلام کو قبول نہیں کرتا تو آپ بھی حکومت چھوڑ دیں یہ اس سے بہتر ہے کہ آپ اقتدار پر تو قائم رہیں مگر اسلام کو چھوڑ دیں۔ اگر کسی مسلمان کے پاس اقتدار ہو اور پھر وہ اسلام کو نافذ نہ کرے تو یہ اللہ کے ہاں ناقابلِ معافی جرم ہے ۔ میں نے ۸۲ء کے اواخر میں جنرل ضیاء کو ایک خط لکھا تھا۔ اس میں میں نے یہ بات کہی تھی کہ میں آپ سے بالکل مایوس ہو چکا ہوں ۔ اسلام کا آپ کوئی کام نہیں کر سکے ۔ یہ سعادت آپ کے حصّہ میں نہیں ہے۔ تو اب آپ نے اسلام کے نام پر اس ملک کی جو سیاسی گاڑی روکی ہوئی ہے خدا کے لئے اس سیاسی گاڑی کو چلنے دیجئے۔ سیاست کا رک جانا اور خلاء پیدا ہو جانا یہ اس ملک کے لئے بہت خوفناک ہے۔ سندھ کے اندر نوجوانوں میں اس طرح کی ایک تحریک جڑ پکڑ چکی ہے جس رخ پر بنگلہ دیش کی تحریک شروع ہوئی تھی اور جو منتج ہوئی مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر ـــــــ!

باقی موجودہ حکومت کے آٹھ سالوں کے بارے میں میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ اسلام کے لئے کچھ بھی نہیں ہوا۔ موجودہ حکمرانوں نے اوپر اوپر کچھ رنگ و روغن لگانے کی کوشش کی ہے لیکن اس سے معاشرے میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں آئی ۔ اس کا نتیجہ یہ کہ عوام اسلام سے مایوس ہو رہے ہیں ۔ اگر عوام کے دل میں یا ذہن میں کسی گوشے میں ایک امید تھی کہ اسلام ایک عادلانہ نظام ہے اور بہت اعلیٰ نظام ہے ۔ سماج، معاش اور سیاست سب کے لئے راہیں متعیّن کرتا ہے تو ان کے دلوں میں امید تھی اسلام آئے گا تو ہمارے مسائل حل ہو جائیں گے، ظلم و ناانصافی کا دور ختم ہو جائے گا۔ رشوت کا قلع قمع ہو جائے گا ۔ یہ ہو جائے گا وہ ہو جائے گا۔ جب ان سے یہ کہا جائے گا کہ اسلام تو آ گیا نافذ کر دیا گیا مگر اب انہیں معاشرے میں کوئی خیر کا پہلو نظر نہیں آتا بلکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہی پریشانیاں، وہی مشکلات، وہی مصائب، وہی نظام جوں کا توں موجود ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ سوچیں کہ اسلام میں بھی ہمارے مسائل کا حل نہیں ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ دَور میں منفی کام زیادہ ہوا ہے ۔ بجائے کسی مثبت کام کے۔

س : ایک اور دعویٰ جو حکومت کی طرف سے بڑے شد و مد کے ساتھ کیا جاتا ہے ۔ وہ سادگی، رزقِ حلال، انسدادِ رشوت اور چادر اور چار دیواری کے تحفظ کا ہے ۔ اس حوالے سے کیا آپ موجودہ حکومت کی کارگزاری پر اطمینان کا اظہار کر سکتے ہیں؟

ج : ان میں سے کسی چیز میں بھی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ۔ بلکہ میرے نزدیک حالات پہلے سے بھی دگرگوں ہو گئے ہیں ۔ رشوت کے بارے میں تو انہوں نے خود تسلیم کر لیا ہے کہ ہم اس کے انسداد میں بالکل ناکام ہو گئے ہیں بلکہ رشوت پہلے سے بھی بڑھ گئی ہے ۔ اسی طرح چادر اور چار دیواری کا جو معاملہ ہے اس میں ضیاء صاحب کا اور پوری حکومت کا جو کردار رہا ہے وہ بہت ہی افسوسناک ہے ۔ انہوں نے جس قدر بے پردگی اور خواتین کی آزادی کی تحریک کو شہ دی ہے اور جس قدر اس کو سپورٹ کیا ہے پروموٹ کیا ہے اور اس کے لئے جو عملی اقدامات کئے ہیں پہلی کسی حکومت نے بھی ایسا نہیں کیا ۔ یہاں تک کہ پیپلز پارٹی کی حکومت بھی اس حد تک نہیں گئی تھی جس حد تک یہ گئے ہیں ۔ ستم ظریفی کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ موجودہ حکمران دین کے باقی معاملات میں تو علماء سے رجوع کرنے کو تیار ہیں لیکن خواتین کے مسئلے پر وہ علماء کی رائے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ۔ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام اس معاملے میں خاموش ہے ۔ میں نے حکومت سے کہا کہ وہ خواتین کے حوالے سے پردے کے مسئلے پر یا دیگر مسائل پر میری بات نہ مانے ۔ شاید میرے خیالات انتہا پسندانہ ہوں مگر آپ دوسرے علماء سے تو رجوع کریں کہ وہ ان مسائل میں کیا راہنمائی کرتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ اس حوالے سے حکمرانوں کے دل میں کوئی چور ہے ۔ اس لئے وہ اسلامی معاشرے میں خواتین کے مقام کو متعین کرنے کے لئے علماء سے رہنمائی لینے کو تیار نہیں ۔

س : حکمرانوں کی طرف سے اکثر یہ بات کہی جاتی ہے کہ اسلام میں حزب اختلاف کا وجود نہیں ۔ اسلامی تاریخ اور تعلیمات کے حوالے سے اس مسئلہ پر آپ کی کیا رائے ہے ؟

ج : رسول اللہ اور خلافتِ راشدہ کے عہد میں تو حزبِ اقتدار تھی نہ حزبِ اختلاف ۔ اسلام میں مقتدر قوت تو خود اسلام ہی ہوتا ہے ۔ اب اگر جدید تقاضوں کے پیش نظر اگر کوئی باقاعدہ حزبِ اقتدار تشکیل پائے گی تو پھر حزبِ اختلاف کے وجود کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا ۔

س : اسلامی معاشرے میں صحافت کا کردار کیا بنتا ہے ۔ موجودہ صحافت کس حد تک اسلامی معاشرے کے تقاضوں کو پورا کر رہی ہے ؟

ج : میرے نزدیک صحافت ایک بہت ہی مفید ادارہ ہے اور عوام کے لئے معلومات کا ایک اہم ذریعہ ہے مگر ایک بات میں پاکستانی صحافت کے حوالے سے کرنا چاہتا ہوں کہ ادب برائے ادب یا زندگی برائے زندگی کی طرح صحافت برائے صحافت کا بھی ایک نظریہ بنا ہے ۔ اس سے بھی زیادہ خرابی یہ آئی ہے کہ صحافت نے ایک کاروبار کی حیثیت اختیار کر لی ہے ۔ اس کے نتیجے میں ہماری صحافت کا میدان نہایت مایوس کن منظر پیش کر رہا ہے ۔ تجارت میں جو اصول ہوتا ہے کہ جو بھی عوام کو پسند ہے اور جو کچھ وہ چاہتے ہیں اس طرح کی چیزیں

اخبارات میں چھاپنا اور کوئی اپنی اخلاقی ذمہ داری قبول نہ کرنا کہ جو مواد ہم دے رہے ہیں وہ کتاب و سنت سے متصادم تو نہیں۔ گویا ہم اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں۔ میرے خیال میں دو اعتبار سے اصحابِ صحافت کو اپنی ذمہ داری محسوس کرنی چاہیئے۔ ایک تو یہ کہ اطلاعات فراہم کرتے وقت اپنی امکانی حد تک تحقیق کرنے کے بعد کوئی خبر شائع کریں۔ دوسرا یہ کہ لوگوں کی رائے بنانے کے لئے، ان کو ذہنی اور فکری غذا دینے کا عمل جو اخبارات نے شروع کر رکھا ہے اس حوالے سے جو مضامین یا آراء اخبارات میں شائع کی جاتی ہیں ان کے بارے میں پوری طرح سے اطمینان کر لینا چاہیئے کہ یہ کہیں قرآن و سنّت کے خلاف تو نہیں۔ ہر اخبار کو علماء کا ایک بورڈ تشکیل دینا چاہیئے کہ جو مضامین اور تجزیے مذہب کے حوالے سے شائع کئے جائیں۔ اشاعت سے پہلے علماء سے ان پر رائے لے لی جائے۔ یہ نہیں کہ اختلافی آراء شائع نہ ہوں بلکہ اس بات کا خیال رہنا چاہیئے کہ آخر اختلافات کی بھی حدود ہیں۔ آپ اگر قرآن و سنّت کی حدود سے باہر کی کوئی چیز شائع کر دیں گے تو یہ ہزاروں لوگوں تک پہنچنے والا مواد کسی کو بھی گمراہ کر سکتا ہے۔ اس صورت میں گمراہی کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟ (بشکریہ "چٹان" لاہور)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔


سیرتِ نبویؐ کے ضمن میں دو عظیم تحفے

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور و امیر تنظیم اسلامی
کے دروس و تقاریر کے دو مجموعے ـــ اعلیٰ دبیز کاغذ پر خوشنما طباعت کے ساتھ

رسول کامل

یعنی پاکستان ٹی وی سے نشر شدہ ۱۲ تقاریر کا مجموعہ اور

فرائض دینی اور اسوۂ رسولؐ

سورۂ احزاب رکوع ۳،۲ کی روشنی میں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سانیو

SANYO

# AIRCONDITIONERS REFRIGERATORS & FREEZERS

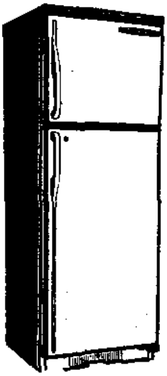

**NO-FROST REFRIGERATORS**

**with exclusive features**

- Two door with built-in lock.
- Spacious freezer compartment with drainage system, a new feature.
- Indicator pilot light on front door.
- In 4 pleasing colours (Green, Gold, Almond and White).
- One Year free service and 5 Years Guarantee on Compressor.

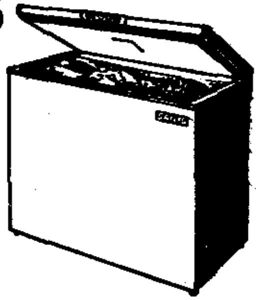

**CHEST/UPRIGHT FREEZERS**

**AIR-CONDITIONERS**

**new in utility**
**with higher efficiency**

Capacity: 1½ Ton, 18000 BTU/h
Noiseless Operation.
Trouble Free Service. Auto Deflector (Swing System).
Brown Teak Wood finish Grill.

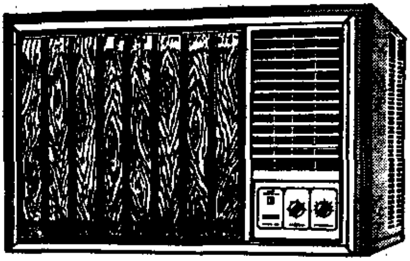

Available at all
SANYO
Authorised Dealers

**MANUFACTURED/ASSEMBLED IN PAKISTAN**

**SPECIAL ATTENTION:** Please ensure that you get your Worldwide Trading Company's 5 year Guarantee Certificate in order to avail free after Sales Service.

SOLE AGENTS IN PAKISTAN FOR ALL SANYO PRODUCTS

## WORLDWIDE TRADING CO.

(SANYO CENTRE)
GARDEN ROAD, SADDAR, KARACHI.
CABLE: "WORLDBEST" TELEX: 25109 WWTCO PK

Phones: 725602
726821

786/WW-109/83

فریش ویل
سوئیٹس
صدیوں پرانی روایات کی حامل ہماری مٹھائیاں اور حلوہ جات یقیناً ہمارے ذائقے اور لذت کی غمازی کرتی ہیں۔ احمد نے اس قدیم پیشے کو جدید دور کے تقاضوں سے ہمکنار کیا اور اپنی مصنوعات کو بالکل منفرد انداز میں پیش کیا۔
پاکستانی تہذیب کا آئینہ دار
دنیا کے ہر براعظم میں احمد کی مٹھائیاں اور حلوہ جات پاکستانی تہذیب اور روایات کی شناخت ہیں۔
Freshwel
حلوہ جوزی
جدید ترین نائٹروجن پیکنگ پلانٹ پر سیلوفین پیکنگ کے ساتھ پیک کئے جاتے ہیں تاکہ تازگی اور خستگی ہمہ وقت برقرار رہے
ٹین کے لِڈ بغیر ٹن کٹر آسانی سے کھل جاتے ہیں۔
سوہن حلوہ
کراچی حلوہ
حبشی حلوہ
حلوہ جوزی
رس گلے
زعفرانی جامن
سوہن ڈیلائیٹ
تلے ہوئے مصالحہ دار بادام
مٹھائیوں میں روایتی اور صنعتی معیار کے خالق
AHMED
احمد کراچی حلوہ مرچنٹ لمیٹڈ
ڈی-۱۱۲، سائیٹ، کراچی۔ فون: ۲۹۴۷۹۱-۹۵


MASS

# افکار و آراء

## مکتوب گرامی مولانا اخلاق حسین قاسمی (دہلی)

گرامی قدر حضرت ڈاکٹر صاحب  السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاجِ محترم!

علی محمد صاحب شیر میوات متولی جامعہ رحیمیہ کی زبانی آپ کی عنایات کا علم ہوا۔ آنجناب نے جامعہ کی جو مالی اعانت فرمائی ہے اس کے لیے ہدیہ تشکر قبول فرمایئے۔ دونوں پرچے[1] برابر مل رہے ہیں اور آنجناب کی سرگرمیوں سے استفادہ کا موقعہ مل رہا ہے،

کل ہی فریدی[2] صاحب سے ملاقات ہوئی، انہیں آپ کے کام سے اسقدر دلچسپی ہے کہ مجھے دورانِ گفتگو میں تاکید کی کہ ڈاکٹر صاحب کے کام سے تعلق رکھنا، ڈاکٹر صاحب کے اندازِ کار سے پاکستان کے اندر مختلف مکاتب فکر کے اندر اتحادِ عمل پیدا ہوگا جو ملت کی شدید ضرورت ہے۔

مولانا علی میاں صاحب ندوی کا تذکرہ بھی کر رہے تھے مولانا دلّی میں مقیم ہیں، فرماتے تھے کہ میں نے علی میاں کو ڈاکٹر صاحب کے کام کی طرف متوجہ کیا اور علی میاں نے تحسین کے کلمات فرمائے۔ طالبِ دعا

اخلاق حسین قاسمی

(۲)

## "رُوبرو" کے متعلق ایک تأثر

محترمی، زاد مجدہ۔ السلام علیکم

دو تین روز اخبارات میں "رُوبرو" کا اشتہار پڑھتا رہا۔ اور کچھ متشوش بھی ہوتا رہا۔ کہ طبعاً میں مجادلہ

---

[1] 'میثاق' اور 'حکمتِ قرآن'،

[2] مولانا افتخار احمد فریدی (مرادآباد۔ بھارت)

اور مناظرہ کے خلاف ہوں فطری کمزوری یا کم علمی کی وجہ سے ۔ بہرحال تبلیغِ دین کے لیے اس کو پسندیدہ نہیں سمجھتا ۔ پھر 'مناظرہ' میں کج بحثی کا احتمال بلکہ اہتمام بھی ہوتا ہے ۔ جس کا ثبوت، آپ کی تقریر میں بار بار مولانا ہاشمی کی مداخلت سے ظاہر بھی ہو گیا۔

آپ نے فراستِ مؤمنانہ سے بہرحال صحیح قدم اٹھایا۔ جو نتیجہ سے ظاہر ہو گیا۔

کل - T.V - پر یہ مباحثہ سن کر، بے حد خوشی ہوئی اور فخر بھی۔ وجہ محتاجِ بیان نہیں۔

آپ کی تقریر نے بہت سے ذہنوں - عوام و خواص - کی الجھنوں اور کج فہمیوں کو صاف کر دیا۔ اور اسلام برپا کرنے کے زوردار پراپاگنڈا کی قلعی بھی کھول دی۔ جزاک اللہ!

ڈاکٹر شیر خاں بنی ایبٹ آباد

(۳)

# ایرانی انقلاب — علمائے کے لیے لمحۂ فکریہ

مکرمی و محترمی جناب ڈاکٹر اسرار احمد السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'!

مئی ۱۹۸۵ء کے "میثاق" میں "کیا ایرانی انقلاب اسلامی انقلاب ہے"؟ کی تیسری اور آخری قسط پڑھ کر ابھی فارغ ہوا ہوں، یہ امر واقعی ہے کہ آپ نے اس اہم موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کر کے "فرضِ کفایہ" ادا کیا ہے درحقیقت یہ ذمہ داری ان علمائے عظام پر عاید ہوتی ہے جو ماشاء اللہ علمِ دین کی باضابطہ سند مستند رکھنے کے ساتھ ساتھ "لعنت ہائے حجازی" کے اصل امین و وارث ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اس موضوع پر کچھ کہنا یا لکھنا خلافِ مصلحت سمجھتے ہوں۔ یہاں علمائے عظام سے میری مراد وطنِ عزیز کے علمائے عظام ہیں ورنہ علمائے ہند میں سے خاص طور پر شیخ الحدیث مولانا محمد منظور احمد نعمانی اور مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے خمینی صاحب کے "اسلامی انقلاب" پر باقاعدہ ایک ایک کتاب لکھی ہے۔

شہنشاہ ایران کی جلاوطنی کے بعد جب خمینی صاحب مع اپنے "اسلامی انقلاب" کے واردِ ایران ہوئے تو انہوں نے سب سے پہلے اپنے دو نمائندے سید ابوالا علی مودودی کے پاس بھیجے ان نمائندوں نے خمینی صاحب کا کیا پیغام مودودی صاحب کو دیا واللہ اعلم لیکن یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ کسی بھی "باطنی تعلق" کی بنا پر جماعت اسلامی کے ذرائع ابلاغ نے بڑے پُرجوش انداز میں خمینی صاحب کے "اسلامی انقلاب" کو وطنِ عزیز میں Project کیا اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ اس موقع پر میں بڑی کشادہ دلی کے ساتھ خمینی صاحب کی "جرأتِ رندانہ" کی تعریف کروں گا کہ انہوں نے "ایرانی انقلاب" کو "اسلامی انقلاب"

کا رنگ دینے اور ...... "سنی شیعہ" کی عدم تفریق کا نعرہ لگانے کے باوجود بغیر کسی تقیہ "پاکستان" کے مذہب جعفریہ کے اصل عقاید بلا کم و کاست اپنی کتابوں میں نہ صرف یہ کہ بیان کیے بلکہ ان کتابوں کو پوری دنیا میں پھیلا دیا۔ راقم الحروف کو "قائد انقلاب ایران" کی تصانیف جلیلہ" اور "خطبات عالیہ" کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا ہے، خمینی صاحب کی تصانیف و خطبات میں دو اصطلاحیں خاص طور پر نظر آئیں گی یعنی "طاغوت" اور "طاغوتیت" جو موصوف نے خاص طور خلفائے ثلثہ یعنی ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کے لیے وضع کی ہیں طاغوتیت کا نعم البدل ایک اور نعرہ ہے "جسے نعرۂ یزیدیت" کہتے ہیں جس کی "معنوی بلاغت" کو بھولے بھالے مسلمان نہیں سمجھ پاتے یہ نعرہ دراصل خلافت راشدہ کے خلاف بطور "علامت" استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کے مخاطب صرف حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ ہیں نہ کہ یزید۔

جناب والا!

یہ بات ببانگ دہل کہی جاتی ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے۔ اس ملک کا قیام سُنیوں اور شیعوں کی مشترکہ کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس لیے سنی شیعہ بھائی بھائی ہیں چلیے تھوڑی دیر کو یہ بھی مانے لیتے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سُنی تو شیعوں کے بھائی ہو گئے۔ اب اس رشتہ کے قائم ہونے کے بعد ان سنیوں کا کیا بنے گا جو صحابہ کرام کی محبت و عقیدت کو اپنا جزو ایمان سمجھتے ہیں؟ کیونکہ خمینی صاحب کے اسلام میں تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ابوذرؓ، عمارؓ یاسرؓ، سلمان فارسیؓ اور مقدادؓ کے علاوہ تمام صحابہ کرامؓ نعوذ باللہ "مرتد" ہو گئے تھے ایسی صورت میں لمحہ فکریہ خمینی صاحب یا ملت جعفریہ کے لیے نہیں بلکہ "سواد اعظم" اور اس کے علمائے عظام کے لیے ہے ..... حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ "سنی شیعہ اتحاد" کے لیے بعض دیوبندی اور بریلوی علماء پیش پیش ہیں غالباً انہیں اس اتحاد کا انجام معلوم نہیں، جب ان سے اس سلسلہ میں وضاحت طلب کی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ ملک کے حالات نازک ہیں اس لیے ہم ایسا کرنے پر مجبور ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ملک کے حالات نازک ہوں تو دشمنان صحابہؓ سے اتحاد کیا جا سکتا ہے اس مسئلہ پر تو علمائے دین و مفتیان شرع متین ہی روشنی ڈال سکتے ہیں:

تیسری قسط میں آپ کا یہ کہنا کہ:۔

"سنی اسلام اور شیعی اسلام میں عقائد کا فرق اتنا واضح اور اتنا متضاد اور متصادم ہے کہ ان میں سرے سے کوئی مصالحت محال مطلق اور قطعی ناممکن ہے کوئی دور از کار تاویل بھی ان دونوں میں کوئی مطابقت پیدا نہیں کر سکتی"۔ ص ۶۹

ہر اعتبار سے درست ہے اس سے قبل سنی شیعہ معتقدات کا یہ فرق و تفاوت امام ابن تیمیہ، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، مولانا عبدالشکور لکھنوی، مولانا احتشام الدین مراد آبادی اور احمد رضا خاں بریلوی اپنی

اپنی تالیفات میں بڑے شرح و بسط کے ساتھ بیان کر چکے ہیں درحقیقت آپ نے انہیں حضرات کے دینی موقف کو آگے بڑھایا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ اپنے موضوعہ خطبات کو جلد از جلد کتابی شکل میں شائع کریں کتاب کی تعداد زیادہ اور قیمت بہت کم ہو تاکہ یہ مفید مضمون ہر سنی مسلمان کی نظر سے گزر سکے۔ والسلام

آپ کا نیازمند سلیم فاروقی کراچی

(۴)

## 'قبلہ' درست ہو گیا ہے

جنابِ مدیر ماہنامہ میثاق۔ لاہور علیکم السلام والتحیہ!

آٹھ سال ہونے کو آرہے ہیں یہ نوید جانفزا سنتے ہوئے کہ پاکستان میں اسلام آرہا ہے۔ لیکن بقول چچا غالب ؎

تیرے وعدے پر جئے تو جان کہ جھوٹ جانا خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

حدود آرڈی ننس کے اجراء کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں چوریاں، ڈاکے، زنا، اغوا جیسے جرائم بالکل ختم ہو گئے ہیں۔ جب ہی تو اس کے بعد کسی اسلامی حد کے اجرا کی تاحال نوبت نہیں آئی۔ رہی کوڑے لگانے کی خبریں! یہ تو سیاسی کارکنوں اور ان لوگوں پر بھی لگائے جارہے ہیں جو اپنے جائز حقوق کے لئے ہمت کر کے کبھی صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔

عرصہ ہوا کہ یہ خوشخبری بھی پاکستانیوں کو سنائی گئی تھی کہ ٹیلی ویژن کا 'قبلہ' درست ہو گیا ہے معلنات کے لئے لازم کر دیا گیا ہے کہ وہ سر پر دوپٹہ اوڑھ کر خبر نامہ نشر کیا کریں۔ اوّل تو یہی بات محلِ نظر ہے کہ مستورات کو مکشوفات بنانے کا کس اسلام سے تعلق ہے! دوسرے یہ کہ چند دن تک تو سر پر دوپٹہ نظر آیا لیکن پھر وہ محض محرم الحرام کے پہلے عشرہ کے لئے محدود ہو کر رہ گیا۔ اور کیوں نہ ہوتا جبکہ ہماری خاتونِ اوّل کے سر سے بھی دوپٹہ ڈھلک گیا ہے۔ اگر ٹی وی کی معلنات نے خاتونِ اوّل کی تقلید میں سر پہ دوپٹہ ڈالنا چھوڑ دیا ہے تو یہ بات قابلِ اعتراض کیسے ہو سکتی ہے!

پھر ٹی وی پہ بہن بھائی مل کر رومانی اور عشقیہ گیت گاتے ہیں۔ ٹی وی کے ارباب بست و کشاد اس پہ فخر کرتے ہیں کہ ہماری ثقافت کتنی ترقی پذیر ہو گئی ہے۔ ثقافت کے نام پر "اسلام" کا جو نیا ایڈیشن تیار کیا جارہا ہے اس پہ موجودہ اربابِ اقتدار مذمت کے نہیں بلکہ 'مبارکباد' کے مستحق ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان کا ناخن مسیحائی اسی طرح کام کرتا رہا تو اکبر کا دینِ الٰہی نئی شکل میں پھر زندہ ہو جائے گا اور جو کام اسلام دشمن عناصر نہ کر سکے وہ 'اسلام دوستوں' کے ہاتھوں سرانجام پا جائے گا۔ برصغیر پاک و ہند میں کئی بار مصنوعی قبلے اور کعبے بنانے کی کوشش ہوئی ہے لیکن اب جس مہارت سے نیا "قبلہ" بنایا جارہا ہے وہ قابلِ داد ہے

مارشل لاء حکومت' اسلام کے نفاذ کے لئے کتنے اہم اقدامات کر رہی ہے اس کا ثبوت لاہور کے ایک گرلز اسکول کے پرنسپل کا مندرجہ ذیل نوٹس مہیا کرے گا جو اس اسکول کی طالبات کے والدین کو بھیجا گیا ہے۔

( School Office )

LAHORE GRAMMAR SCHCOL-II

FOR BOYS & GIRLS

1-Shah Jemal

Lahore, Feb:13, 1985.

The School will be starting a Dance Club every Saturday from 10-30 a.m. to 12 O'Clock. The dance teacher will be Amy Minwalla. The charges for the Club will be Rs. 100/- a month. The fee should be deposited during school hours by February the 28th. The joining of this Club will be purely optional. This Dance Club will only be operational should there be 15 or more students.

آج ملّت اسلامیہ پاکستان کو ایک ایسے مردِ مومن، مردِ حُر اور بطلِ عزیمت کی ضرورت ہے جو موجودہ دور کے سامری" کے بت کو پاش پاش کر دے۔ قالین کے شیر قالین پر سجتے ہیں۔ جو لوگ ان کو حقیقی اور اصل شیر سمجھ بیٹھے ہیں ان کے حق میں یہی دعا کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو عقل و فہم عطا فرمائے۔

نیاز کیش : جمال رحمانی - لاہور

(۵)

## ایک رباعی!

مکرمی و محترمی - السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

التماس ہے کہ ۱۲ اپریل ۸۵ کو محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب از راہِ لطف و کرم ہمارے یہاں تشریف لائے تھے۔ موصوف کے ساتھ جناب حکیم نصیر الدین نظامی ندوی جناب شہاب الدین کریمی اور جناب راغب مرادآبادی اور چند دوسرے حضرات نے بھی قدم رنجہ فرمایا تھا۔ مکان کے کمرۂ نشست میں اس شعر کا طغریٰ لگا ہوا تھا جو صحابہ کرامؓ غزوہ احزاب میں پڑھا کرتے تھے۔

نحن الذین بایعوا محمدًا

علی الجہاد ما بقینا ابدًا

محترم ڈاکٹر صاحب نے جناب راغب مراد آبادی سے فرمائش کی کہ اس شعر کو اردو میں منتقل کر دیں۔ چنانچہ راغب صاحب نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد یہ رباعی لکھ دی:

حاصل یہ جہاد میں سعادت کی ہے
پیغمبرِ اسلام کی بیعت کی ہے!!!
تا زیست محمدؐ ہی کے ہم ساتھ رہیں
اے بارِ الٰہ، بس یہ نیّت کی ہے!

خواہش ہے کہ راغب صاحب مراد آبادی کی یہ فکری کاوش قارئینِ میثاق تک پہنچ جائے۔ لہٰذا اس عریضہ کو 'میثاق' میں جگہ دینے کی درخواست ہے۔

نیاز مند، انور جمیل۔ کراچی


نظر و دھوپ کی عینکوں کا مرکز

العزیز آپٹیکل کمپنی

یہاں آنکھوں کا معائنہ یورپ کے تعلیم یافتہ آنکھوں کے سپیشلسٹ کرتے ہیں۔ جدید امریکن مشین کا بھی انتظام ہے

فیس معائنہ ۲۰ روپے ● بوقت ۲/۱ ۴ بجے شام

العزیز بلڈنگ ۲-اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور

# فریضۂ امر بالمعروف و نہی عن المنکر

## مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی تحریر سے ایک اقتباس

"یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر صرف جماعت علماء کا فریضہ ہے۔ لیکن درحقیقت یہ خیال عملاً اور اعتقاداً ایک ایسی خطرناک غلطی تھی جس کو میں نہیں سمجھتا کہ کن لفظوں سے تعبیر کروں۔ ان تیرہ سو برس میں اسلام کو ان تمام غلط فہمیوں سے سابقہ پڑا جو اس سے پہلے امم سابقہ کو پیش آ چکی ہیں۔ لیکن کسی سخت سے سخت غلط فہمی نے بھی مسلمانوں کو ایسا لاعلاج نقصان نہیں پہنچایا، جیسا اس غلط فہمی سے پہنچا۔ رؤسائے روحانی اور پیشوایانِ مذہب نے جو منکر کا نہ اختیارات اپنے لئے محفوظ کر لئے تھے، اُن کی بیڑیاں پھر اس غلط فہمی کی لعنت سے مسلمانوں کے پاؤں میں پڑ گئیں۔ یہی وہ معاصی ہیں جن کی پاداش میں اقوام گذشتہ نے خدا سے اپنا رشتہ توڑا تھا جس کی وجہ سے بنی اسرائیل کو نیابت الٰہی سے معزول کر کے مسلمانوں کو اس پر سرفراز کیا تھا۔

...... دنیا کے تمام مذہب کے انحطاط و ہلاکت کی ایک بڑی علت مذہبی رؤساء کا معبودانہ اقتدار ہے۔ اسلام نے اس زہر کا تریاق اس اصل الاصول کو تجویز کیا تھا کہ امر بالمعروف کو عام اور ہر فردِ ملت پر پھیلا دیا۔ تاکہ مخصوص گروہ کے لئے کبھی ذریعہ اقتدارِ مطلق حاصل کرنے کا موقع نہ رہے۔"

مرسلہ: ڈاکٹر منشی بہادر خان پنج مدظلہٗ، ایبٹ آباد۔

ٹینٹ اور ترپال

بنانے کا
ممتاز ادارہ

# ایچ نظام دین اینڈ سنز

مرکزی دفتر

محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

Coca-Cola
Coca-Cola is it!
TRADE MARK REGD
paragon

بعثتِ انبیاء و رسل کا اساسی مقصد ـــــ اور

بعثتِ محمدی کی تمامی و تکمیلی شان ـــــ نیز

اِنقلابِ نبوی کا اساسی منہاج ـــــ

ایسے اہم موضوعات پر

ڈاکٹر اسرار احمد

کی

حد درجہ جامع تصنیف

# نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت

کا مطالعہ کیجئے

اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ طباعت ○ قیمت فی نسخہ ۱۴ روپے

مرکزی انجمن خدام القرآن ○ ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن ○ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# الحمد للہ

# ایک اور اعزاز

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے گزشتہ سالوں کی طرح ۸۳-۱۹۸۲ء کے دوران
بھی ہماری بہترین برآمدی کارکردگی اور وطن عزیز کے لیے کثیر زرمبادلہ کمانے پر فیڈریشن آف
پاکستان چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری کی جانب سے ہم ایک بار پھر

## بہترین برآمدی کارکردگی کی ٹرافی

کے مستحق قرار پائے

یہ ٹرافی جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب صدر پاکستان نے ایک پُروقار تقریب میں اپنے ہاتھوں سے ہمیں عطا فرمائی۔

ہمیں خیمے۔ ترپالیں اور کینوس کی دیگر مصنوعات کے سب
سے بڑے برآمد کنندگان ہونے کا بجا طور پر شرف حاصل ہے۔

SNDS

## حاجی شیخ نور الدین اینڈ سنز لمیٹڈ

پاکستان میں کینوس مصنوعات کے سب سے بڑے برآمد کنندگان

ہیڈ آفس: حفیظ چیمبرز، ۸۵۔ شاہراہ قائد اعظم، لاہور (پاکستان)
فون: ۳۰۶۴۶۸ - ۳۰۵۴۶۹، تار: شاهی خیمه ٹیلکس: 44543 NOOR PK

ایکسپورٹ آفس: ۶۱۶ - ۶۱۴ کامرس سینٹر، چھٹی منزل، حسرت موہانی روڈ۔ کراچی (پاکستان)
فون: ۲۱۳۵۴۰ - ۲۱۴۳۸۷، تار: 'TARPAULIN' ٹیلکس: 25480 NOOR PK

Regd. L. No. 7360

MONTHLY "MEESAQ" LAHORE

| Vol. 34 | AUGUST 1985 | No. 8 |
|---|---|---|



# Siddiq Sons Industries Ltd.

Largest Manufacturers & Exporters of :

*WATERPROOF COTTON CANVAS, TARPAULINS, TENTS, WEBBING AND OTHER CANVAS PRODUCTS,*

HEAD OFFICE :

5-C, 5th FLOOR, SIDCO EVENUE CENTRE
264-R. A. LINES, KARACHI (PAKISTAN)

2 - K GULBERG II, SHAHRAH-E-IQBAL, LAHORE.
TELEFHONE : 870512 880731